مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات قرآن وحدیث کی ہدایات اور امام اوزاعیؒ وامام محمد شیبانیؒ کے اجتہادات کی روشنی میں

خالد سیف اللہ رحمانی

اسلامی قانون کا ایک حصہ ''سیر'' کہلاتا ہے، جس میں بین قومی تعلقات اور صلح وجنگ سے متعلق اُمور پر بحث کی جاتی ہے، قانون سیر کو سب سے پہلے نہایت تفصیل کے ساتھ امام محمد بن حسن شیبانیؒ نے پیش کیا، مستشرقین کو بھی اعتراف ہے کہ اس شعبۂ قانون کو سبقت اور تقدم حاصل ہے، امام محمدؒ کے علاوہ جن فقہاء کو اس باب میں امتیاز حاصل ہے ان میں ایک فقیہ شام امام اوزاعیؒ بھی ہیں، سال درسال پہلے اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کی تجویز پر جامعۃ الامام اوزاعی (اُردن) نے اکیڈمی کے اشتراک سے ایک سیمینار کرنا طے کیا تھا، اس کے لئے سیمینار کے داعیوں کی خواہش پر اس حقیر نے یہ مقالہ تھا، اگرچہ کہ سیمینار نہ ہوسکا؛ لیکن یہ مقالہ قارئین کے استفادہ کے لئے موضوع کی اہمیت کے اعتبار سے شائع کیا جارہا ہے۔ (مدیر)

موجودہ عالمی حالات کے پس منظر میں مسلمانوں اور غیر مسلم بھائیوں کے درمیان تعلقات کا مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کرگیا ہے اور پوری دنیا میں اس موضوع کو اسلام کو بدنام کرنے اور مسلمانوں کو رسوا کرنے کے لئے استعمال کیا جارہا ہے، یہاں تک کہ جو قومیں نسلی تفریق پر یقین رکھتی ہیں، جیسے یہودی اور ہندو برہمن اور ان کی مددگار طاقتیں، وہ بھی مسلمانوں کو بدنام کرنے پر تلی ہوئی ہیں اور خود انسانی حقوق کی علم بردار بنی ہوئی ہیں، اس پس منظر میں ضرورت ہے کہ بین قومی تعلقات اور مختلف مذاہب اور ان کے ماننے والوں کے احترام نیز دنیا میں امن وامان قائم رکھنے کے سلسلے میں اسلامی تعلیمات اور فقہاء اسلام کے نظریات کو وضاحت وتفصیل کے ساتھ پیش کیا جائے۔

پوری انسانیت — ایک کنبہ

اس سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ قرآن مجید کے ارشاد کے مطابق پوری انسانیت کا آغاز ایک ہی ہستی کے وجود سے ہوا ہے، خدا نے اسی ہستی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور اس جوڑے سے پوری انسانیت وجود پذیر ہوئی :

يٰاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيْراً وَّنِسَاءً ۔ (النساء:۱)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا ہے اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا ہے، نیز ان دونوں سے بہت سے مرد وعورت کو وجود بخشا۔

اس طرح اسلام کی نظر میں پوری انسانیت ایک ہی کنبہ اور خاندان ہے، یہ ایک ہی درخت کی شاخیں اور ایک ہی گلدستہ کے پھول ہیں، اس سے ہمیں انسانی اُخوت کا سبق ملتا ہے، جیسے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، اسی طرح ہر انسان انسانی رشتہ سے ہمارا بھائی اور ہمارے وسیع تر خاندان اور کنبہ کا ایک حصہ ہے، یہ اُخوت و بھائی چارگی ہمیں محبت و پیار کا پیغام دیتی ہے اور اس جانب متوجہ کرتی ہے کہ ہمارے دل میں ہر فرد بشر سے محبت ہونی چاہئے۔

شرافتِ انسانی کا تصور

باہمی انسانی روابط کی دوسری بنیاد انسانی شرافت وکرامت اور احترامِ آدمیت ہے، انسان کو بحیثیت انسان اللہ تعالیٰ نے قابل احترام قرار دیا ہے :

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىْ آدَمَ ۔ (بنی اسرائیل:۷۰)

ہم نے انسان کو معزز بنایا ہے۔

اس کے جسمانی سانچہ کو بہترین سانچہ قرار دیا گیا ہے، ارشاد ہے :

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِىْ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۔ (التین:۴)

ہم نے انسان کو بہترین قالب میں پیدا کیا ہے۔

یہ تکریم واحترام تمام بنی نوعِ انسان سے متعلق ہے اور اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی تفریق نہیں ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے عملی طور پر اس حقیقت کو واضح فرمایا ہے، ایک بار ایک یہودی کا جنازہ جارہا تھا، آپ ﷺ کھڑے ہوگئے، لوگوں نے عرض کیا کہ یہ یہودی کا جنازہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: جان تو اس میں بھی ہے (۱)، غزوۂ احزاب ک

(۱) بخاری، حدیث نمبر:۱۳۱۲، باب من قام بجنازة یهودی۔

موقع سے ایک مشرک مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا، اہل مکہ نے خواہش کی کہ اس کی قیمت لے کر لاش ان کے حوالہ کردیں، تو آپ ﷺ نے کوئی قیمت لئے بغیر لاش واپس کردی (۱)؛ کیوں کہ انسانی نعش کی قیمت وصول کرنا انسانی احترام کے مغائر ہے، اسلام سے پہلے جنگ کا کوئی قانون نہیں تھا اور لوگ مقتول کے اعضاء تراش کر ہار پہنتے اور اپنی آتش انتقام بجھاتے تھے، اسلام نے ایک تو حتی المقدور جنگ سے بچنے کا حکم دیا؛ لیکن اگر اس کی نوبت آہی جائے تو جنگ کے مہذب قوانین مقرر کئے، من جملہ ان کے یہ ہے کہ اگر کوئی شخص گرفت میں آجائے تو ایذاء پہنچا کر قتل نہ کیا جائے اور جو مارے جائیں، ان کے اعضاء کاٹے نہ جائیں کہ یہ احترامِ انسانیت کے خلاف ہے۔ (۲)

کافر کہنا تحقیر نہیں

اسلام بحیثیتِ انسان کسی غیر مسلم کی توہین وتحقیر کو بھی روا نہیں رکھتا، بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ غیر مسلم کے لئے ''کافر'' اور ''ذمی'' کا لفظ استعمال کرکے ان کی تحقیر کی گئی ہے، یہ محض غلط فہمی اور پروپیگنڈہ ہے، کافر دراصل غیر مسلم کا ہم معنی ہے ''کفر'' کے معنی انکار کے ہیں، قرآن مجید میں یہ لفظ انکار ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے؛ چنانچہ منکرین آخرت کے بارے میں ارشاد ہوا: ''وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كَافِرُوْنَ'' (یوسف:۳۷) اہل مکہ کو ان باتوں سے انکار تھا، جس کی دعوت رسول اللہ ﷺ دیا کرتے تھے، اس لئے وہ کہتے تھے: ''اِنَّا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كَافِرُوْنَ'' (الزخرف:۲۴) یعنی ''آپ جس دین کو لے کر بھیجے گئے ہیں ہم اس کا انکار کرتے ہیں'' اسی طرح جادو کے انکار پر بھی کفر کا اطلاق کیا گیا ہے؛ چنانچہ بعض انبیاء علیہم السلام کے مخالفین کا قول نقل کیا گیا ہے :

قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَاِنَّا بِهٖ كَافِرُوْنَ ۔ (الزخرف:۳۰)

پس ''کافر'' کے معنی انکار کرنے والے، یعنی ایسے شخص کے ہیں جو توحید اور اسلامی تعلیمات کو قبول نہیں کرتا ہو، گویا یہ غیر مسلم (Non Muslim) کا ہم معنی لفظ ہے، پس یہ ایک حقیقت کا اظہار ہے نہ کہ کسی شخص کی توہین۔

اگر کافر کا لفظ اہانت آمیز ہوتا تو اس پر سب سے زیادہ اعتراض اہل مکہ کو ہوتا؛ کیوں کہ قرآن مجید میں بار بار ان کو ''کافرون'' کے لفظ سے مخاطب کیا گیا ہے اور ایک مختصر سورت بھی اسی نام سے موسوم ہے؛ لیکن سیرت کی کتابوں میں کہیں یہ بات نہیں آتی کہ انھوں نے اس لفظ کا برا مانا ہو۔

پھر باوجود یکہ یہ لفظ اہانت آمیز نہیں ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی کو ''اے کافر'' کہنے سے ایذاء ہوتی ہو تو اس کو اس طرح خطاب نہ کیا جائے اور اگر خطاب کرے گا تو گنہگار ہوگا :

لو قال لذمي : يا كافر ، يأثم إن شق عليه ۔ (۳)

---

(۱) البداية والنهاية:۱۰۷/۴۔ (۲) ترمذی:۴۰۱/۲۔ (۳) الأشباه والنظائر:۲۵۷/۲۔

ذمی کا لفظ اہانت آمیز نہیں

اسی طرح عربی زبان میں ''ذمہ'' کے معنی ''عہد'' کے ہیں، ''ذمی'' اس شخص کو کہا جاتا ہے، جس کی حفاظت کا عہد کیا جائے، چنانچہ عربی زبان کی مشہور لغت ''لسان العرب'' میں ہے :

رجل ذمی ، معناه له عهد ۔ (۱)

مرد ذمی کے معنی ایسے شخص کے ہیں جس کے لئے عہد کیا گیا ہو۔

اسی طرح علامہ ابن اثیرؒ اس بات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہ غیر مسلم اقلیت کو اہل ذمہ کیوں کہا جاتا ہے؟ رقمطراز ہیں :

سمی أهل الذمة لدخولهم فی عهد المسلمین و أمانتهم ۔ (۲)

اہل ذمہ اس لئے نام رکھا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے عہد اور ان کی امان میں داخل ہوجاتے ہیں۔

اس لئے یہ محض غلط فہمی ہے کہ قرآن مجید اور حدیث نبوی ﷺ میں غیر مسلم کے لئے اہانت آمیز تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

غیر مسلموں کے مختلف گروہ اور ان کا حکم

جہاں تک مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات کی بات ہے تو اس سلسلے میں بنیادی طور پر دو پہلو پیش نظر رہنا چاہئے: اول یہ کہ اسلام کی نسبت سے تمام غیر مسلموں کا رویہ یکساں نہیں رہتا ہے؛ بلکہ مختلف گروہوں کا سلوک الگ الگ ہوسکتا ہے، اس اعتبار سے ان کی تین قسمیں فقہاء کے یہاں ملتی ہیں اور امام محمد شیبانی نے اپنی کتابوں میں اس کو وضاحت سے لکھا ہے :

(۱) اہل ذمہ: یہ مسلم حکومت میں بسنے والے غیر مسلم ہیں، خواہ وہ اقلیت میں ہوں یا اکثریت میں ہوں۔

(۲) موادعین: وہ غیر مسلم ممالک اور ان کے باشندے جن سے مسلمانوں کی صلح ہو، اگر کسی ملک سے باضابطہ صلح نہ ہو؛ لیکن وہاں کا کوئی باشندہ تجارت یا کسی اور غرض سے خصوصی اجازت (امان) لے کر مسلمان ملک میں آجائے یا مسلمان ملک کا کوئی شہری ـــ خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر ذمی ـــ خصوصی اجازت لے کر دارالحرب میں تجارت وغیرہ کے لئے جائے، تو ایسے شخص کو ''مستامن'' کہتے ہیں؛ اگرچہ مسلمان اور اس غیر مسلم حکومت کے

(۱) لسان العرب:۵۹/۵۔

(۲) النهایة:۱۶۸/۲۔

درمیان حکومتی سطح پر کوئی معاہدہ نہیں ہوتا؛ لیکن امان لے کر داخل ہونے والے مسلمان کی دارالحرب کے شہریوں سے اور اسی طرح امان لے کر داخل ہونے والے کافر کی مسلم مملکت کے مسلمان شہریوں سے صلح سمجھی جائے گی اور جو احکام دو ایسی قوموں سے متعلق ہیں، جن میں آپس میں صلح ہوئی ہو، وہی ان پر بھی نافذ ہوں گے۔

(۳) محاربین: یعنی دارالحرب میں بسنے والے لوگ، جو مسلمانوں سے برسر جنگ ہوں اور جن کا مسلمان مملکت سے کوئی معاہدۂ امن نہ ہو۔

غیر مسلموں کی ان تینوں قسموں کا ذکر امام اوزاعی اور امام محمد کے بشمول اجمال یا تفصیل کے ساتھ تمام ہی فقہاء کے یہاں موجود ہے، دارالحرب کی تعریف کے سلسلے میں گو فقہاء کے یہاں کسی قدر تعبیر کا اختلاف پایا جاتا ہے؛ لیکن خلاصہ یہی ہے کہ جہاں مسلمان اپنے آپ کو مامون نہ پاتے ہوں اور انھیں اپنے دین پر عمل کرنے کی آزادی حاصل نہ ہو، وہ دارالحرب ہے؛ چنانچہ علامہ علاء الدین کاسانیؒ نے دارالاسلام اور دارالحرب کی تفصیلی بحث کا حاصل ان الفاظ میں لکھا ہے :

ومعناه ان الامان إن كان للمسلمين فيها على الإطلاق والخوف للكفرة على الاطلاق ، فهى دارالاسلام ، وان كان دارالامان فيها للكفرة على الاطلاق ، فهى دارالكفرة ۔ (۱)

گویا جس ملک میں مسلمان مامون ہوں، وہ دارالحرب نہیں، یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اگر کسی خطہ میں اسلامی احکام پر بھی عمل کئے جائیں اور وہاں احکام کفر بھی جاری ہوں، تب بھی اس کا شمار دارالحرب میں نہیں ہوگا؛ چنانچہ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں :

لو اجريت احكام المسلمين واحكام اهل الشرك ، لاتكون دارالحرب۔ (۲)

اور اسلامی احکام کے جاری ہونے سے مراد تمام احکام کا اجراء نہیں ہے؛ بلکہ بقول علامہ علاء الدین حصکفیؒ کے، اگر وہاں جمعہ وعیدین وغیرہ پڑھی جاتی ہے تو یہ بھی اجراء احکام اسلام میں داخل ہے :

و دارالحرب تصير دارالاسلام باجراء احكام اهل الاسلام فيها كجمعة وعيد ۔ (۳)

دارالحرب کے باشندے محاربین کہلاتے ہیں، موجودہ دور میں غیر مسلم ممالک کی غالب اکثریت وہ ہے، جہاں جمہوری نظام اختیار کیا گیا ہے، اس نظام کے تحت ملک کے تمام شہریوں کو اپنے اپنے مذہب کے مطابق عقیدہ

(۱) بدائع الصنائع: ۱۳۱/۷۔ (۲) ردالمحتار: ۲۵۳/۳۔ (۳) الدرالمختار مع الرد: ۲۵۳/۳۔

رکھنے، مذہب پر عمل کرنے اور مذہب کی تبلیغ کرنے کی اجازت ہوتی ہے، اس پہلو سے دیکھا جائے تو آج کی دنیا میں بہت کم ممالک ایسے ہیں، جن کو دارالحرب کہا جاسکے، اسی طرح اقوام متحدہ کے ممبر ممالک اُصولی طور پر اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کی سرحدوں کا احترام کریں گے، یہ اور بات ہے کہ بعض سرکش ممالک بعض اوقات اپنے اس عہد کی خلاف ورزی بھی کر گذرتے ہیں، بہر حال داخلی نظام میں جمہوریت اور خارجہ پالیسی میں دوسرے ممالک کے اقتدار کے احترام کرنے کا عہد یہ دو ایسی باتیں ہیں، جن کی وجہ سے کہا جاسکتا ہے کہ آج کی دنیا میں بہت کم ممالک ایسے ہیں، جن کو دارالحرب کہا جاسکے۔

اس پس منظر میں مسلم غیر مسلم تعلقات سے متعلق جو احکام ان سطور میں کتاب وسنت اور فقہاء بالخصوص امام اوزاعیؒ اور امام محمدؒ کے حوالہ سے ذکر کئے جائیں گے، وہ مسلم ممالک میں بسنے والے غیر مسلم اور ایسے غیر مسلم ممالک سے متعلق ہوں گے، جہاں مسلمانوں کو اپنے ہم وطنوں کے ساتھ پُر امن طریقہ پر رہنے کی اجازت ہے، دارالحرب اور حربیوں سے متعلق احکام قوانین جنگ، استیمان یعنی امان حاصل کر کے آنے والے لوگوں اور قیدیوں اور سفیروں سے متعلق ملتے ہیں، جن کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفاء کیا جائے گا۔

تعلقات کی مختلف جہتیں

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کی بھی مختلف نوعتیں ہیں اور بہ حیثیتِ مجموعی ان کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :

(الف) سماجی تعلقات۔

(ب) معاشی تعلقات۔

(ج) سیاسی تعلقات۔

(د) فوجی تعلقات۔

(ہ) مذہبی تعلقات۔

تعلقات کے ان تمام دائروں کے سلسلے میں قرآن وحدیث اور فقہاء کے اجتہادات سے ہمیں روشنی ملتی ہے۔

سماجی تعلقات

سماجی تعلقات کے سلسلہ میں بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے :

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۔ (الممتحنة:۸)

جولوگ تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کرتے اور نہ انھوں نے تم کو تمہارے گھر سے نکالا ہے، اللہ تعالیٰ تم کو ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور انصاف برتنے سے نہیں روکتے، بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔

غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک

یہ آیت بنیادی اہمیت کی حامل ہے اور اس سے یہ بات واضح ہے کہ جو غیر مسلم مسلمانوں سے برسر پیکار نہ ہوں، مسلمانوں پر ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرنا ضروری ہے، قرآن مجید نے صاف کہا ہے کہ کسی قوم کا ہدایت کے راستہ پر آنا اور دین حق کو قبول کرنا اللہ تعالیٰ کی توفیق پر منحصر ہے؛ لیکن اس کی وجہ سے کسی گروہ کے ساتھ بے تعلقی کا معاملہ کرنا اور حسن سلوک سے رُک جانا درست نہیں، مسلمان ان کے ساتھ جو بہتر سلوک کریں گے، انھیں بہر حال اس کا اجر مل کر رہے گا :

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلٰكِنَّ اللهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَاءُ ، وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ، وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللهِ ، وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ ، وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۔ (البقرۃ:۲۷۲)

ان لوگوں کی ہدایت آپ کے ذمہ نہیں ہے، اللہ جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں اور تم جو کچھ خرچ کرتے ہو وہ اپنے ہی لئے کرتے ہو اور خرچ نہیں کرتے ہو مگر اللہ کی خوشنودی کی تلاش میں اور جو بھی خرچ کرو گے تم کو پورا پورا دے دیا جائے گا (یعنی اس کا اجر ملے گا) اور تم پر ظلم نہیں ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بعض انصار کی بنو قریظہ اور بنو نضیر کے یہودیوں سے قرابت تھی، انصار ان پر اس لئے صدقہ نہیں کیا کرتے تھے کہ جب ضرورت مند ہوں گے تو اسلام قبول کریں گے، اللہ تعالیٰ نے ان کے اس رویہ کو پسند نہیں کیا اور فرمایا: ''ان کی ہدایت کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے؛ لیکن تم اس کی وجہ سے اپنا دست تعاون نہ کھینچو؛ کیوں کہ تم کو تمہارے انفاق کا اجر مل کر رہے گا۔(۱)

رسول اللہ ﷺ اور آپ کے رفقاء نے عملی طور پر اس کو برت کر دکھایا، مکہ میں شدید قحط پڑا، لوگ مردار وغیرہ کھانے پر مجبور ہو گئے، یہ زمانہ مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان شدید اختلاف اور گرما گرمی کا تھا، اس کے باوجود آپ ﷺ نے مکہ کے قحط زدہ مشرکین کے لئے پانچ سو دینار بھیجا، حالاں کہ اس وقت خود مدینہ کے مسلمان

(۱) الجامع لأحکام القرآن:۳/۳۳۷۔

سخت مالی دقتوں اور فاقہ مستیوں سے دوچار تھے، نیز آپ ﷺ نے یہ رقم سردارانِ قریش ابوسفیان اور صفوان بن اُمیہ کو بھیجی، جو مسلمانوں کی مخالفت میں پیش پیش تھے اور مشرکین مکہ کی قیادت کررہے تھے۔(۱)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بوڑھے غیر مسلم کو دیکھا کہ وہ بھیک مانگ رہا ہے، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وجہ پوچھی تو کہا کہ ہمیں جزیہ ادا کرنا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر فرمایا اور کہا: ہم نے تمہاری جوانی کو کھایا اور اب پھر تم سے جزیہ وصول کریں، یہ انصاف کی بات نہیں ہے''**ما أنصفناک أکلنا شیبتک، ثم نأخذ منک الجزیة**''(۲) چنانچہ فقہاء کے ہاں اس پر تو قریب قریب اتفاق ہے کہ صدقات نافلہ غیر مسلموں کو دیا جاسکتا ہے، حنفیہ کے نزدیک بشمول امام محمدؒ راجح یہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے صدقات واجبہ بھی غیر مسلموں کو دیئے جاسکتے ہیں(۳)؛ البتہ امام اوزاعیؒ کے نزدیک صدقاتِ نافلہ تو غیر مسلم کو دیئے جاسکتے ہیں، زکوٰۃ اور صدقات واجبہ نہیں دیئے جاسکتے۔(۴)

انسانی زندگی کا احترام وتحفظ

سماجی زندگی میں سب سے اہم مسئلہ امن وامان کا ہے اور امن وامان کا تعلق جان ومال اور عزت وآبرو سے ہے؛ چنانچہ شریعت اسلامی میں غیر مسلموں کی جان ومال اور عزت وآبرو کو وہی اہمیت دی گئی ہے، جو مسلمانوں کی جان ومال اور عزت وآبرو کو، اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ نے یہ اُصولی بات ارشاد فرمائی ہے کہ ان کے خون ہمارے خون کی طرح اور ان کے مال ہمارے مال کی طرح ہیں :

دمائهم کدمائنا ، وأموالهم کأموالنا ۔(۵)

چنانچہ قرآن مجید نے مطلق نفس انسانی کے قتل سے منع کیا ہے، ارشاد ہے :

لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۔ (بنی اسرائیل:۳۳)

کسی نفس کو جس کے قتل کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے، ناحق قتل نہ کرو۔

ایک اور موقع پر کسی معقول سبب کے بغیر ایک شخص کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا گیا :

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ۔ (المائدۃ:۳۲)

---

(۱) ردالمحتار:۳۰۲/۳،باب الصرف۔ (۲) نصب الرایة:۴۵۴/۳۔

(۳) دیکھئے:الدرالمختار علی هامش رد:۳۰۱/۳۔

(۴) دیکھئے:موسوعة فقه الإمام الأوزاعیؒ ، زکوٰۃ ۶/ ،زکوٰۃ الفطر ۵/ ،کفارۃ ۵/أ۔

(۵) نصب الرایة:۳۶۹/۴۔

جس نے کسی نفس انسانی کو کسی دوسرے کے بدلے یا زمین میں فساد کے بغیر قتل کیا تو گویا اس نے پوری انسانیت کو قتل کر دیا۔

کیوں کہ اگر کوئی شخص ایک بے قصور کو قتل کر سکتا ہے تو وہ انسانیت کے کسی بھی شخص کو قتل وغارت گری کا نشانہ بنا سکتا ہے، اس لئے گویا وہ پوری انسانیت کا قاتل ہے، ان آیات میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی قید نہیں ہے؛ بلکہ مطلقاً کسی بھی انسان کے قتل کو منع فرمایا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس غیر مسلم — جس سے امن اور بقاء باہم کا معاہدہ ہو — کے قاتل کے بارے میں فرمایا کہ وہ جنت کی بو سے بھی محروم رہے گا :

من قتل معاهدا لم يرح رائحة الجنة ، وإن ريحها يوجد من مسيرة أربعين يوما ۔(۱)

جس نے کسی معاہد (وہ غیر مسلم جس سے پر امن زندگی گذارنے کا معاہدہ ہو) کو قتل کیا وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا؛ حالاں کہ اس کی بو چالیس سال کے فاصلہ سے محسوس کی جاسکتی ہے۔

اگر کوئی مسلمان غیر مسلم کو قتل کر دے تو مسلمان کو بھی اس کے قصاص میں قتل کر دیا جائے گا، کیوں کہ قرآن مجید نے علی الاطلاق قصاص کا یہی اُصول بتایا ہے کہ جو شخص دوسرے شخص کا قاتل ہو، وہ اس کے بدلے قتل کیا جائے گا ''اَلنَّفْسُ بِالنَّفْسِ ''(المائدۃ:۴۵) اس میں مسلمان غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں ایک غیر مسلم (ذمی) کے قصاص میں ایک مسلمان کو قتل کیا گیا(۲)، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے ''ذمی'' کے بدلے مسلمان کے قتل کا حکم دیا(۳)، امام شافعیؒ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کیا ہے کہ انھوں نے بعض اہل ذمہ کو قتل کرنے والے مسلمانوں کو قتل کرنے کا حکم فرمایا۔(۴)

یہ حنفیہ کا نقطۂ نظر ہے اور یہی رائے امام محمد بن حسن شیبانیؒ سے صراحتاً منقول ہے، چنانچہ فرماتے ہیں'' **لان المسلم يقتل بالذمي عندنا** ''(۵)؛ امام اوزاعیؒ کے نزدیک کافر کے بدلہ مسلمان قتل نہیں کیا جائے گا۔(۶)

(۱) بخاری، حدیث نمبر:۳۱۶۶، عن عبد الله بن عمروؓ۔
(۲) مصنف عبد الرزاق:۱۰/۱۰۱۔
(۳) مصنف عبد الرزاق:۱۰/۱۰۱۔
(۴) مسند امام شافعی ، سنن البیهقی:۱۲/۴۳۔
(۵) شرح السیر الکبیر:۴/۵۲۔
(۶) دیکھئے:موسوعة فقه الإمام الأوزاعي:جنايه:۳۔

اگر مقتول کے ورثہ سزائے قتل کو معاف کر دیں، یا قتل کے واقعہ میں قصد وارادہ کو دخل نہ ہو؛ بلکہ غلطی سے قتل کا ارتکاب ہوا ہو، تو ان صورتوں میں قصاص کے بدلہ خون بہا (دیت) واجب ہوتا ہے؛ چنانچہ خون بہا بھی مسلمان اور غیر مسلم کا یکساں ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے غیر مسلم کی دیت مسلمان ہی کی طرح ادا کی (۱) حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ اور مختلف صحابہ کرامؓ سے منقول ہے کہ مسلمان اور غیر مسلم کی دیت برابر ہوگی، علامہ زیلعیؒ نے تفصیل سے ان روایتوں کو نقل فرمایا ہے۔(۲)

جس غیر مسلم سے مسلمانوں کا معاہدہ ہو، اس کی جان کی اہمیت اور اس کے تحفظ کا اس درجہ اہتمام کیا گیا کہ اگر کوئی حربی بھی امان لے کر مسلمانوں کے ملک میں آئے اور وہی غیر مسلم ملک یا کوئی مسلم ملک کسی مسلمان قیدی کے فدیہ کے طور پر اس غیر مسلم کی حوالگی کا مطالبہ کرے اور اس غیر مسلم حربی کو اندیشہ ہو کہ اگر وہ حوالہ کیا گیا، تو اسے قتل کر دیا جائے گا تو ایسی صورت میں ایک مسلمان قیدی کو بچانے کے لئے اس مستامن حربی کی جان کو خطرہ میں ڈالنا جائز نہیں؛ چنانچہ امام محمدؒ فرماتے ہیں :

فان دخل حربی منهم الینا بامان ، فطلبوا مفاداة الاسیر بذلک المستامن و کره ذلک المستامن وقال ان دفعتمونی الیهم ، قتلونی ، فلیس ینبغی لنا ان ندفعه الیهم ، لانه فی أمان منا ، فیکون کالذمی ، اذا کره المفادة به ، ولانا نظلمه فی التعریض بقتله بالرد علیهم ، والظلم حرام علی المستامن والذمی والمسلم ۔ (۳)

یہاں تک کہ اگر اس پناہ لینے والے شخص کی وجہ سے اس ملک کے حملہ کرنے کا اندیشہ ہو، تب بھی مسلمانوں کے لئے اسے حوالہ کرنا مناسب نہیں :

وان قال المشرکون للمسلمین ، ادفعوه الینا و إلا قاتلناکم ، ولیس بالمؤمنین علیهم قوة ، فلیس ینبغی للمسلمین ان یفعلوا ذلک ؛ لانه غدر منا ۔(۴)

امام اوزاعیؒ کے یہاں اگر چہ حربی مستامن کے حقوق کے سلسلے میں بہت زیادہ وضاحت نہیں ملتی؛ لیکن ان کے نزدیک بھی مستامن پر زیادتی قابل سرزنش جرم ہے :

---

(۱) سنن دار قطنی:۱۷۸/۸،کتاب الدیات ، بات دیة اهل الذمة۔

(۲) دیکھئے:نصب الرایة:۳۶۹/۴-۳۶۸۔

(۳) شرح السیر الکبیر:۳۰۰/۳۔

(۴) شرح السیر الکبیر:۳۰۰/۳۔

قال الاوزاعیؒ فی رجل من العدو إستامن إلی المسلمین ، فلقیه رجل من المسلمین ، فقتله بعد أمانه عمدا أو خطأ ، قال : إن قتله خطاء ، فعلی عاقلته ، ثم یوقف عقله ، فان جاء ولی یثبت ، دفع الیه عقله ، وان کان عمداً عاقبه الامام ، وجعل عقله فی ماله خاصة ، فان جاء ولی له دفعه الیه۔ (۱)

موادعین یعنی وہ قوم جس سے مسلمانوں کا بقاء باہم کے اُصول پر ایک دوسرے کے ساتھ پرامن طریقہ پر رہنے کا عہد ہو، اگر اس کے بعض افراد مسلمانوں کے دشمن ملک میں کسی غرض سے گئے ہوں اور مسلم فوج کے حملہ کے درمیان وہ پکڑے جائیں اور یہ بات ثابت ہوجائے کہ وہ موادعین میں سے ہیں، تو امام محمدؒ کے نزدیک ان سے بھی تعرض کرنا جائز نہیں :

ولو دخل رجل من موادعینا دار الذین وادعوهم بتلک الموادعة ، فقاتلنا اهل تلک الدار ، فظهرنا علیهم ، فقال الرجل : انا من اهل دار موادعیکم دخلت الی هٰولاء لموادعة بیننا وبینهم ، لم یقبل قوله الا بحجة ۔(۲)

اور یہی حکم مسلمان ملک میں بسنے والے غیر مسلم یعنی ذمیوں کے لئے بھی ہے :

ولو قال : کنت ذمیا ، دخلت إلی هذه الدار للتجارة فأقام البینة من المسلمین لم یحل اسره وقتله ۔(۳)

دارالحرب (دشمن ملک اور اس کے وہ شہری، جنھوں نے امان حاصل نہیں کیا ہو) پر اگرچہ حملہ کرنا جائز ہے؛ لیکن ایسے ملک کے بھی سفیر پر حملہ کرنا جائز نہیں؛ چنانچہ امام محمدؒ کی معروف کتاب المبسوط میں ہے :

قلت : أرأیت الرجل من أهل الحرب یوجد فی دار الاسلام فیقول : أنا رسول ، ویخرج کتاب الملک معه ؟ قال : إذا عرف أنه کتاب الملک ، کان آمنا ، حتی یبلغ رسالته ویرجع ، وان لم یعرف أنه کتاب الملک فهو فيء وجمیع ما معه ۔ (۴)

---

(۱) موسوعة فقه الإمام الأوزاعیؒ:۱۷۸،معزیا الی مختصر اختلاف العلماء:۲۹۲/۱۱۔

(۲) شرح السیر الکبیر:۹/۲۔ (۳) شرح السیر الکبیر:۹/۲۔

(۴) کتاب السیر والخراج والعشر:۱۶۳۔

یہی بات امام محمدؒ نے مزید وضاحت کے ساتھ ''سیر صغیر'' میں بھی لکھی ہے :

واذا وجد الحربي في دارالاسلام ، فقال : أنا رسول وأخرج كتاب الملك معه ، فإذا عرف أنه كتابه ، كان آمنا ، حتى يبلغ رسالته ويرجع ۔ (۱)

املاک کا احترام

رسول اللہ ﷺ نے جو اُصول مقرر فرمایا کہ غیر مسلموں کی جانیں مسلمانوں کی جانوں کی طرح ہیں اور ان کے مال مسلمانوں کے مالوں کی طرح، اس سے معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کی املاک بھی اسی طرح قابل احترام ہیں جیسا کہ مسلمانوں کی، بغیر رضامندی کے نہ کسی مسلمان کا مال لیا جاسکتا ہے، نہ کسی غیر مسلم کا ''**اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ**''۔(النساء:۲۹)

فتح خیبر کے موقع سے بعض مسلمان فوجیوں نے یہودیوں کے جانور ذبح کر دیئے اور کچھ پھل کھالئے، رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے اس موقع پر مختصر خطاب کیا، اس عمل پر ناگواری ظاہر کی اور فرمایا کہ یہ تمہارے لئے حلال نہیں ہے۔(۲)

متعدد صحابہ کرامؓ سے آپ ﷺ کا ارشاد منقول ہے :

ألا ! من ظلم معاهداً أو انتقصه أو كلفه فوق طاقته أو أخذ منه شيئا بغير طيب نفس ، فأنا حجيجه يوم القيامة ۔ (۳)

آگاہ ہوجاؤ! جس نے کسی معاہد پر ظلم کیا، اس کی حق تلفی کی، یا اسے اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلّف کیا، یا اس سے کوئی چیز اس کی رضامندی کے بغیر لے لی، تو میں قیامت کے دن اس کا فریق ہوں گا۔

اسلامی قانون کی رو سے چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، جیسے مسلمان کا مال چوری کرنے میں ہاتھ کاٹا جائے گا، اسی طرح اگر کوئی مسلمان چور غیر مسلم کا مال چوری کرلے تو اس صورت میں بھی اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، علامہ ابن قدامہ مقدسیؒ نے یہ لکھتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ یہ مسئلہ فقہاء کے یہاں متفق علیہ ہے(۴)، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی نظر میں مسلمان اور غیر مسلم کی ملکیت یکساں قابل احترام ہے۔

---

(۱) كتاب السير الصغير:۳۴۔

(۲) سنن أبي داود، حدیث نمبر:۳۰۵۰۔ (۳) سنن أبي داود، حدیث نمبر:۳۰۵۳۔

(۴) المغنی لابن قدامة:۱۲/۴۵۱، مع تحقيق : عبد الله بن عبد المحسن وغیرہ۔

امام محمدؒ نے معاہدین کے املاک کے بارے میں اُصولی بات لکھی ہے کہ :

وإذا وادع المسلمون قوما من المشركين فليس يحل لهم أن ياخذوا شيئاً من أموالهم إلا بطيب أنفسهم للعهد الذى جرى بيننا وبينهم فإن ذلک العهد في حرمة التعرض للأموال والنفوس بمنزلة الإسلام فكما لايحل شي ء من أموال المسلمين إلا بطيب أنفسهم فكذلک لا يحل شي ء من أموال المعاهدين ۔ (۱)

یہاں تک کہ اگر جنگ کی صورت حال نہ ہو اور کوئی مسلمان امان لے کر دارالکفر میں گیا ہو تو اس کے لئے بھی کسی غیر مسلم کا مال بلا اجازت لینا جائز نہیں؛ چنانچہ امام اوزاعیؒ سے منقول ہے :

إذا دخل المسلم دارالكفر بأمان ، فليس له أن ياخذ من أموالهم شيئا إلا باذنهم ولا ياكل منهم الربا ؛ لان المومن ليس بختار ولاغدار ۔ (۲)

حنفیہ میں امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مسلمان مستامن کے لئے حربی سے اگرچہ درہم ودینار کے باہمی تبادلے میں زیادہ رقم لینی جائز ہے؛ کیوں کہ یہ ان کے نزدیک سود نہیں؛ اس لئے کہ سود تو مالِ معصوم کا لینا ہے اور حربی کا مال معصوم نہیں ہوتا ہے، تاہم حنفیہ کے یہاں بھی حربی کی رضامندی کے بغیر اس کا مال لینا جائز نہیں؛ چنانچہ امام ابویوسفؒ فرماتے ہیں :

فبای وجه أخذ أموالهم برضا منهم ، فهو جائز ۔ (۳)

یہی نقطۂ نظر امام اوزاعیؒ کا بھی ہے اور ان کے نزدیک تو غیر مسلم سے ربا لینا بھی حرام ہے (۴) —— بلکہ حربی مستامن کا انتقال مسلمان ملک میں ہوگیا، تب بھی امام اوزاعیؒ نے صراحت کی ہے کہ اس کا مال دارالحرب میں اس کے ورثہ کو بھیج دیا جائے گا :

إذا مات المستامن في دارالاسلام وترک مالاً ، وورثته في دارالحرب : إن كانوا اولىٰ بميراثه من المسلمين أعطي ورثته ميراثه بكتاب ملكهم أنهم ورثته وشهادة بعضهم لبعض ۔ (۵)

---

(۱) شرح السير الكبير:۹۲/۱۔

(۲) موسوعة فقه الإمام الأوزاعیؒ :۱۷۹۔

(۳) الرد على سير الاوزاعى:۹۶۔ (۴) حوالۂ سابق۔

(۵) موسوعة فقه الإمام الأوزاعیؒ:۷۸،معزيا إلى الأوسط:۲۷۳/۱۱۔

عزت وآبرو کی حفاظت

یہی معاملہ عزت وآبرواور عفت وعصمت کی حفاظت کا ہے، رسول اللہ ﷺ نے بلاتفریق مذہب ہر بڑے کی توقیر کا حکم دیا ہے اور ہر چھوٹے پر شفقت اور محبت کی تلقین کی ہے(۱) مومنوں سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

يٰاَ يُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اِجْتَنِبُوْا كَثِيْراً مِّنَ الظَّنِّ ، اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ ، وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۔ (الحجرات:۱۱)

اے ایمان والو! ایک گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اُڑائے، ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہو اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا تمسخر کریں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، نہ ایک دوسرے پر طعن کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب دو۔

اسی طرح مردوں سے فرمایا گیا کہ وہ اپنی نگاہوں اور شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور یہی حکم مسلمان عورتوں کو بھی دیا گیا(النور:۳۱) یہ حکم مطلق ہے، اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی تفریق نہیں، معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کی عزت وآبرو کی بھی وہی اہمیت ہے، جو مسلمانوں کی ہے، عفت وعصمت کو مجروح کرنے والی جو چیزیں حرام ہیں، خواہ مسلمانوں کے ساتھ کی جائیں، یا غیر مسلموں کے ساتھ، مطلقاً حرام ہیں، جو سزا کسی مسلمان عورت کی آبرو ریزی کی ہے، وہی سزا غیر مسلم عورت کی آبروریزی کی ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ عزت وآبرو کی حفاظت کا وہی حق غیر مسلم باشندوں کو حاصل ہے، جو مسلمانوں کو حاصل ہے۔

البتہ دارالحرب سے جنگ کے درمیان جو عورتیں گرفتار ہوں، وہ باندی ہیں اور مسلم حکومت انھیں تقسیم کردے، تو جو عورت جسے دی جائے، اس کے لئے اس سے انتفاع جائز ہے؛ لیکن یہ ایک قانونی عمل ہے، ایسا نہیں ہے کہ کوئی بھی مسلمان کسی غیر مسلم عورت کو پکڑ لے، تو وہ اس کے لئے مباح ہوجائے، یہاں تک کہ امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں :

أما لو وطئ جارية من المغنم قبل أن تصير إليه فإنه يجلد مائة جلده ، وتقوم قيمة عدل ويلحق ولدها به ۔(۲)

خوشی وغم میں شرکت

سماجی تعلقات کے دائرہ میں کھانا، کھلانا، پڑھنا، پڑھانا، باہمی ملاقات، خوشی وغم کے موقع پر دلداری وغیرہ

---

(۱) ترمذی، حدیث نمبر:۱۹۱۹، باب ماجاء في رحمة الصبيان۔ (۲) موسوعة فقه الإمام الأوزاعیؒ:۲۹۳۔

اُمور بھی آتے ہیں، اسلام نے ان تمام شعبوں میں غیر مسلموں کے ساتھ بھی خوش گوار برتاؤ کا حکم دیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے غیر مسلموں کی دعوت قبول فرمائی ہے، (۱) خود غیر مسلموں کو دعوت دی ہے (۲) انھیں اپنا مہمان بنایا ہے (۳) اپنے رفقاء کو غیر مسلم بزرگوں کی تجہیز وتکفین کے انتظام کا حکم دیا ہے (۴) نیز غیر مسلموں کی عیادت کی ہے۔ (۵)

رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں فقہاء نے غیر مسلموں سے متعلق جو احکام دیئے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں :

- مجوسی کا ہر قسم کا کھانا جائز ہے، سوائے ذبیحہ کے۔
- مسلمان کا مشرک رشتہ دار کے ساتھ صلہ رحمی کرنا درست ہے، وہ نزدیک کا ہو یا دور کا اور ذمی ہو یا حربی، حربی سے مراد وہ شخص ہے، جو دشمن ملک کا شہری ہو۔
- مسلمانوں کے لئے عیسائی پڑوسی سے مصافحہ کرنا درست ہے۔
- یہودی اور عیسائی کی عیادت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔
- جب کسی غیر مسلم کی وفات ہوجائے تو اس کے عزیز سے عیادت کے لئے یہ الفاظ کہے جائیں :

أخلفک الله خيرا منه ، وأصلحک ۔ (۶)

اللہ تجھ کو اس کا نعم البدل عطا فرمائے اور تمہاری حالت کو بہتر کرے۔

یہ احکام فقہاء احناف کی طرف منسوب ہیں، جن میں ظاہر ہے کہ امام محمد بھی شامل ہیں، امام اوزاعی کے یہاں اس کی صراحت نہیں مل پائی؛ لیکن بظاہر ان کا نقطۂ نظر بھی یہی ہوگا؛ کیوں کہ بہت سے فقہاء نے غیر مسلم کو سلام کرنے سے منع کیا ہے؛ لیکن امام اوزاعیؒ کا رجحان اس کے جواز کی طرف ہے :

سئل الأوزاعي عن مسلم مر بكافر ، فسلم عليه ؟ فقال : إن سلمت فقد سلم الصالحون قبلک ، يريد : ابن مسعود وأبا أمامة ، وإن تركت ، فقد ترک الصالحون ۔ (۷)

تعلیم وتعلم کا تعلق

غیر مسلموں سے تعلیم وتعلم بھی درست ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا علم وحکمت مؤمن کی متاعِ گم شدہ ہے

---

(۱) بخاری، حدیث نمبر: ۲۶۱۷، باب قبول الهدية من المشركين۔ (۲) الدر المنثور: ۱۸۱/۵۔
(۳) الخصائص الکبریٰ: ۱۲۳/۸۔ (۴) إعلاء السنن: ۲۸۲/۸، باب مايفعل المسلم إذا مات له ......۔
(۵) بخاری، حدیث نمبر: ۵۶۵۷، باب عيادة المشرک۔
(۶) الفتاویٰ الهندية: ۳۸۴/۵۔ (۷) موسوعة فقه الإمام الأوزاعیؒ: ۴۵۴۔

''**الكلمة الحكمة ضالة المؤمن**''(۱) چنانچہ جنگ بدر کے قیدیوں میں جو لوگ پڑھنے سے واقف تھے آپ ﷺ نے ان کا فدیہ یہی مقرر کیا تھا کہ وہ دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں (۲) اسی لئے تعلیم وتعلم کے مقدس رشتہ میں مذہب کی بنیاد پر کوئی تفریق روا نہیں رکھی گئی ہے۔

البتہ سماجی تعلقات میں اس بات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ اسلام نے وضع قطع، رسم ورواج وغیرہ میں اس بات کو پسند کیا ہے کہ مسلمان اپنی شناخت کو باقی رکھیں اور اپنے تہذیبی تشخص کو کھو نہیں دیں؛ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ :

ليس منا من تشبه بغيرنا ۔ (۳)

جو دوسروں کی مماثلت اور مشابہت اختیار کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

اسی لئے آپ ﷺ نے سلام کے طریقہ، ڈاڑھی اور سر کے بال کی وضع وغیرہ میں اس بات کو پسند نہیں کیا ہے کہ مسلمان اپنے امتیاز کو کھو دیں، یہ دونوں باتیں فقہاء کے یہاں متفق علیہ ہیں۔

معاشی تعلقات

معاشی تعلقات کے معاملہ میں بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی تفریق نہیں، نبوت کے بعد بھی رسول اللہ ﷺ کا ابوسفیان اور جبیر بن مطعم کے ساتھ مضاربت کے طریقہ پر تجارت کرنا منقول ہے، اسی طرح خیبر کے فتح ہونے کے بعد آپ ﷺ نے وہاں کی اراضی یہودیوں کے قبضہ میں ہی رہنے دی اور ان سے بٹائی پر معاملہ طے کرلیا، جس کا بخاری اور مختلف کتب احادیث میں ذکر موجود ہے (۴)، مسلمانوں کے لئے یہ بات درست ہے کہ وہ کسی غیر مسلم کے یہاں ملازمت کریں؛ چنانچہ حضرت علیؓ نے ایک یہودی کے یہاں مزدوری کی ہے، کتب احادیث میں اس کا ذکر موجود ہے (۵) حضرت خبابؓ لوہاری کے فن سے واقف تھے، انھوں نے عاص بن وائلؓ کے لئے کام کیا، اس کا ذکر بھی احادیث میں موجود ہے ''**خباب كان قينا فعل للعاص بن وائل**''۔(۶)

اسی طرح یہ بات بھی درست ہے کہ مسلمان غیر مسلموں کو اپنے یہاں ملازمت کا موقع دیں، عرب میں سڑکوں کا کوئی باضابطہ نظام نہیں تھا اور پورا خطہ عرب ریت سے ڈھکا ہوا تھا، اسی لئے راستہ کی شناخت میں دشواری ہوتی تھی اور جن لوگوں کو شناخت نہیں ہوتی تھی وہ سفر میں کسی راہ بتانے والے کو ساتھ لے جاتے تھے، ان کو ''دلیل'' کہا جاتا تھا، جس کے معنی راہبر کے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے جب مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو ایک مشرک کو اپنے لئے

(۱) ترمذي، حديث نمبر: ۲۶۸۷، عن أبي هريرةؓ۔ (۲) البداية والنهاية: ۳۲۸/۳۔
(۳) ترمذي، حديث نمبر: ۲۶۹۵۔ (۴) بخاری، حديث نمبر: ۴۲۴۸، باب معاملة النبي اعلى أهل خبير۔
(۵) كنز العمال: ۳۲۱/۲۔ (۶) بخاری، حديث نمبر: ۲۳۷۵، مسلم، حديث نمبر: ۷۰۶۲۔

بطور ''دلیل'' اُجرت دے کر ساتھ رکھا،(۱) اسی لئے فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ مسلمان غیر مسلم کو اپنے یہاں ملازم رکھ سکتے ہیں ''یجوز أن یکون الأجیر ذمیا والمستأجر مسلما بلا خلاف''۔(۱)

چنانچہ مسلم عہدِ حکومت میں غیر مسلم حضرات بڑے اونچے اور کلیدی عہدوں پر فائز رہے ہیں، حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے میں حمص کا فینانشیل کمشنر اور حاکم، ابن اثال نامی ایک عیسائی تھا، عبدالملک بن مروان کا کاتب ابن سرجون تھا، یہ بھی عیسائی تھا، کاتب کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اسی سے فرامین سلطنت کی مراسلت متعلق تھی اور بقول علامہ شبلیؒ وزیر اعظم کے برابر یا اس سے دوسرے درجہ پر خیال کیا جاتا تھا، عباسی دور میں ابواسحاق صابی اس منصب پر فائز تھا، سلطنت دیلم کے تاجدار عضدالدولہ جیسے عظیم فرمانروا کا وزیر اعظم بھی ایک عیسائی تھا، جس کا نام نصر بن ہارون تھا، یہ تمام فرمانروا نہ صرف اپنی طاقتور حکمرانی میں ممتاز تھے؛ بلکہ مذہب سے بھی ان کا خاصا تعلق تھا؛ لیکن ان کی مذہبیت غیر مسلم بھائیوں سے سلطنت کے اہم اور کلیدی شعبوں میں خدمت لینے میں حارج نہیں ہوئی۔(۳)

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان معاشی تعلقات کے سلسلے میں فقہاء کا نقطۂ نظر اس بات سے واضح ہوجاتا ہے کہ انھوں نے اجارہ، بیع، مزارعت، مساقات، مضاربت، شرکت وغیرہ میں فریقین یا ان میں سے ایک کے مسلمان ہونے کو ضروری قرار نہیں دیا ہے اور یہ بات فقہاء کے نزدیک متفق علیہ ہے؛ بلکہ حربیوں سے بھی معاشی تعلقات کی ممانعت نہیں رکھی گئی ہے، مسلمانوں کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ امان حاصل کرکے دارالکفر میں غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کریں، امام اوزاعیؒ نے بھی اس کی صراحت کی ہے(۴) اور امام ابویوسفؒ نے بھی۔(۵)

بلکہ دارالحرب کے غیر مسلم باشندے کو بھی اجازت ہوگی کہ وہ مسلمان ملک میں امان لے کر تجارت کرے؛ چنانچہ امام محمدؒ فرماتے ہیں :

وإذا دخلها مشرک تاجر علی أن یتجر ویرجع إلی بلاده لم یمنع من ذلک ، وإنما یمنع من أن یطیل فیها المکث حتی یتخذ فیها مسکنا ۔ (۶)

اگر وہ دارالحرب کا باشندہ نہ ہو؛ بلکہ ایسے ملک کا باشندہ ہو، جن سے مسلمانوں کی صلح ہو، تب تو انھیں امان لے کر بھی آنے کی ضرورت نہیں، امان لئے بغیر بھی وہ ایک مسلم ملک میں آکر تجارت کرسکتے ہیں؛ چنانچہ امام محمدؒ فرماتے ہیں :

---

(۱) أحکام أهل الذمة لابن قیم:۲۰۷۔ (۲) الموسوعة الفقهیة:۱۰۵، مادہ:اجارہ۔
(۳) تفصیل کے لئے دیکھئے:مقالاتِ شبلی:۲/۲۱۹-۲۱۷۔ (۴) موسوعة فقه الإمام الأوزاعیؒ:۹۷۔
(۵) دیکھئے:الرد علی سیر الأوزاعیؒ:۹۶، باب بیع الدرهم بالدرهمین في أرض الحرب بأمان۔
(۶) شرح السیر الکبیر:۳/۲۵۷۔

قلت : أرأيت إن دخل منهم إلى دار الاسلام تاجر بغير أمان إلا الموادعة التي كانت لهم ؟ قال : هو آمن بتلك الموادعة ۔(۱)

سیاسی تعلقات

انسان جس خطہ میں رہتا ہو، وہاں کے سیاسی حالات سے بے تعلق نہیں رہ سکتا ؛ کیوں کہ سیاسی مد و جزر اور اُتار چڑھاؤ کا اثر زندگی کے تمام شعبوں پر پڑتا ہے اور بڑی حد تک سماج کا امن وامان بھی ان حالات سے متعلق ہوتا ہے؛ چنانچہ اسلام میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی روابط کی گنجائش رکھی گئی ہے، سیاست کا مقصد ملک میں قانون کی حکمرانی کو قائم رکھنا اور مستحکم بنانا ہے، رسول اللہ ﷺ جب اس دنیا میں تشریف لائے ،اس وقت حجاز کے علاقہ میں کوئی باضابطہ حکومت موجود نہیں تھی ؛ البتہ قبائلی روایات اور دستور کے مطابق تحفظ ہوا کرتا تھا اور لوگوں کے باہمی تعلقات قائم رہتے تھے۔

سیاسی اشتراک

اسی زمانہ میں مکہ میں ایک واقعہ پیش آیا کہ مکہ کے ایک شخص نے ایک بیرونی شخص کا حق ادا کرنے سے انکار کر دیا، چوں کہ اس کا تعلق مکہ سے نہیں تھا اور مکہ میں اس کے قبیلہ کے لوگ بھی نہیں تھے، اس لئے ممکن نہیں تھا کہ وہ بزور طاقت اپنا حق حاصل کر سکے، اس غریب الوطن شخص نے صحن کعبہ میں اہل مکہ کو اپنی بپتا سنائی اور ان کے ضمیر سے انصاف کے طلب گار ہوئے ،اس موقع سے کچھ لوگ اس کی مدد کے لئے کھڑے ہوئے اور عبداللہ بن جدعان کے مکان پر اس کی نشست ہوئی ،اس میں آپ ﷺ نے بھی پوری سرگرمی سے شرکت کی اور اس طرح ''حلف الفضول'' نامی ایک تنظیم قائم ہوئی ،جس کا مقصد انصاف کو قائم کرنا ،ظلم کو روکنا اور ظالم کے خلاف مزاحمت کرنا تھا ، یہ واقعہ نبوت سے پہلے کا تھا؛ لیکن رسول اللہ ﷺ کو یہ کام اس قدر پسند آیا تھا کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر مجھے آج بھی اس کی طرف بلایا گیا تو میں اس پر لبیک کہوں گا ''**لو أدعى به في الإسلام لأجبت**''۔(۲)

بنو اُمیہ کے دور میں حضرت حسینؓ اور ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کے درمیان ایک مسئلہ پر نزاع پیدا ہوگئی ، جس میں ولید کی زیادتی تھی ،حضرت حسینؓ نے اس سلسلہ میں اسی حوالہ سے لوگوں کی مدد چاہی ، یکے بعد دیگرے کئی صحابہؓ نے اس پر لبیک کہا، بالآخر ولید کو اپنے ارادہ سے باز آنا پڑا (۳) یہ واقعہ اس بات کے لئے بنیاد فراہم کرتا ہے کہ

(۱) كتاب السير والخراج والعشر:۱۵۵،باب موادعة اهل الحرب۔

(۲) البداية والنهاية :۲۹۱/۲۔

(۳) سيرت ابن هشام:۱۳۵/۱۔

سیاسی جدوجہد میں مسلمان اور غیر مسلم ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک کر سکتے ہیں اور سیاسی تعلقات میں اُصولوں کی بنیاد پر غیر مسلموں کا تعاون کیا جا سکتا ہے اور ان سے تعاون لیا جا سکتا ہے، نیز ایسی سیاسی تنظیموں میں جو خالص مسلم تنظیم نہ ہو، مسلمان شریک ہو سکتے ہیں۔

قرآن مجید نے حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ تفصیل سے ذکر کیا ہے، مصر میں اس وقت مشرکین ہی کی حکومت تھی، حضرت یوسف علیہ السلام نے ملکی مفادات اور مصالح کو سامنے رکھتے ہوئے وزارت خزانہ طلب فرمایا ''قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَائِنِ الْاَرْضِ ''(یوسف:۵۵)حضرت یوسف علیہ السلام کی خواہش قبول کی گئی اور انھوں نے اس فریضہ کو بہت ہی خوش اُسلوبی کے ساتھ انجام دیا، اس سے معلوم ہوا کہ ایسے اقتدار میں شریک وسہیم ہونا بھی درست ہے، جس میں غیر مسلموں کو غلبہ حاصل ہو۔

فقہاء کے یہاں غیر مسلموں کے ساتھ سیاسی اشتراک کی تفصیل عام طور پر نہیں ملتی؛ کیوں کہ اس زمانہ میں ایسی مملکت کا تصور نہیں تھا، جس میں مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ اقتدار میں شریک وسہیم ہوں؛ کیوں کہ ایک تو شاہی حکومت ہوتی تھی، جس میں اقتدار فرد واحد پر مرکوز ہوتا تھا، دوسرے عام طور پر سلطنت کا ایک مذہب متعین ہوتا تھا، دوسرے مذہب کے لوگوں کو اگر اس ملک میں پرامن طریقہ پر رہنے کی اجازت مل جاتی، تو یہی بہت بڑی بات تھی، ان کا اقتدار میں شریک ہونا ناقابل تصور تھا؛ البتہ فقہاء کے ذکر کئے ہوئے اُصولوں سے ہم اس سلسلے میں فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

مبنی برانصاف قوانین کی اطاعت

غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے سیاسی تعلقات دو اُصولوں پر مبنی ہوں گے، اول: ان قوانین کی اطاعت جو مبنی برانصاف ہوں؛ کیوں کہ جب آپ کسی ملک کی شہریت قبول کرتے ہیں تو یہ زبان حال سے اس ملک کے دستور کی پاسداری اور فرمانبرداری کا اقرار ہے اور ایک طرح کا عہد ہے جو ہم نے ملک کے ساتھ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ عہد کو پورا کرو''اَوْفُوْ بِالْعُقُوْدِ ''(المائدۃ:۱)ایک اور موقع پر فرمایا گیا''اَوْفُوْ بِالْعَهْدِ '' (الاسراء:۳۴)یعنی''معاہدات اور وعدوں کی پاسداری کرو''قانون شکنی کو اسلام جائز قرار نہیں دیتا، بشرطیکہ وہ صریحاً عدل کے خلاف نہ ہوں۔

چنانچہ ہمیں امام محمدؒ کے کلام کی تشریح کرتے ہوئے علامہ سرخسیؒ کی یہ بات ملتی ہے :

وفی الصلح یجب الوفاء بالشروط ۔ (۱)

---

(۱) شرح السیر الکبیر:۲/۱۱۵۔

جمہوری ممالک میں دستور کی حیثیت بھی دراصل مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان صلح کی ہے، معاہدہ میں کئے جانے والی شرطوں کی اہمیت کا حال یہ ہے کہ اگر مسلمان قیدی سے دارالحرب کا حکمراں کوئی حلفیہ عہد لے لے، تو اس کو بھی پورا کرنا لازم ہے، چنانچہ امام محمدؒ فرماتے ہیں :

إذا استحلف ملكهم الاسير بالأيمان المغلظة أن لا يخرج إلى بلاد المسلمين فحلف على ذلك ، فاليمين لازمة ۔(۱)

فقہاء نے تو اہل حرب سے بھی بغیر جزیہ کے موادعت کی اجازت دی ہے، جیسا کہ امام محمدؒ فرماتے ہیں :

قلت : أرأيت قوما من اهل الحرب طلبوا إلى المسلمين الموادعة سنين معلومة بغير جزية ، أينبغى للمسلمين أن يعطوهم ذلك ؟ قال : نعم ينبغى لامام المسلمين أن ينظر فى ذلك ، فان كانت لهم شوكة لا يستطيعهم و كانت موادعتهم خيرا للمسلمين وادعهم ۔(۲)

امام محمدؒ کے یہاں ہمیں اس کی بھی صراحت ملتی ہے کہ اگر کسی ملک میں حکمراں کا پہلے سے کوئی قانون موجود ہو اور صلح میں شامل ہو کہ ہم اس میں مداخلت نہیں کریں گے، تو مسلمانوں کو اپنے عہد پر قائم رہنا چاہئے :

ملك من ملوك أهل الحرب له أرض واسعة ، فيها قوم من أهل مملكته ، هم عبيد له ، يبيع منها ماشاء ، ثم صالح المسلمين وصار ذمة لهم ، فإن أهل مملكته عبيد له كما كانوا يبيعهم إن شاء ۔(۳)

ایک جمہوری ملک میں غیر مسلموں کے ساتھ مل کر سیاست میں حصہ لینا اور حسب موقع اقتدار میں شریک وسہیم بننا موادعت کی زیادہ باعزت شکل ہے، جس میں بہت سی دفعہ مسلمان اقلیت میں رہنے کے باوجود اقتدار کے اعلیٰ ترین عہدوں تک پہنچ سکتے ہیں، جیسا کہ ہندوستان کے مسلمان اس کا تجربہ کر رہے ہیں اور ضروری ہے کہ ایسی صورت میں ہم باہمی معاہدات کا احترام کریں۔

ظلم کی مخالفت میں باہمی تعاون

سیاسی اشتراک کی دوسری بنیاد ظلم کی مخالفت اور اس کے سدِ باب میں باہمی تعاون ہے، قرآن مجید میں متعدد مقامات پر منکر کو روکنے کا حکم دیا گیا ''منکر'' میں تمام برائیاں شامل ہیں اور یقیناً ظلم بھی اس میں داخل ہے،

(۱) شرح السير الكبير:۲۲۳/۴۔

(۲) كتاب السير والخراج والعشر:۱۵۳،باب موادعة أهل الحرب۔

(۳) السير الصغير:۲۹،باب صلح الملوك والموادعة۔

رسول اللہ ﷺ نے منکر کو روکنے کے طریقہ کار کے سلسلہ میں یہ اُصول بتایا کہ اس کے لئے قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے طاقت کا استعمال کرسکتا ہو تو اس کا استعمال کرے، اگر طاقت کا استعمال نہیں کرسکتا، تو زبان سے اس کے خلاف احتجاج کرے اور اگر زبان کے استعمال سے بھی عاجز ہے، تو دل سے اس کو برا مانے اور عزم رکھے کہ جب بھی ممکن ہوگا وہ ظلم کو دفع کرنے کی کوشش کرے گا :

من رأى منكم منكرا فليغيره بيده ، ومن لم يستطع فبلسانه ، ومن لم يستطع فبقلبه ، وذلك أضعف الإيمان ۔ (۱)

تم میں سے جو شخص کسی برائی کو دیکھے تو چاہئے کہ بزور بازو اسے بدلنے کی کوشش کرے، اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے اور اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو دل سے اور یہ ایمان کا کمتر درجہ ہے۔

''ید'' ایک علامتی لفظ ہے اور ہاتھ سے مراد طاقت ہے، اس زمانہ میں ووٹ اور پرامن احتجاج بھی ایک طاقت ہے، اسی طرح زبان سے منکر کو روکنے میں زبان کے ذریعہ ظلم کے خلاف احتجاج کرنا شامل ہے، اسی لئے قرآن مجید نے بری بات کو زبان پر لانے اور علی الاعلان کہنے کو منع کیا ہے؛ لیکن ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی اجازت دی ہے :

لَا يُحِبُّ اللهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۔ (النساء:۱۴۸)

اللہ تعالیٰ بری بات کے زور سے کہنے کو پسند نہیں کرتے، سوائے اس کے کہ وہ مظلوم ہو۔

حدیث میں احتجاج کے بعض اور طریقے بھی منقول ہیں۔(۲)

غیر مسلموں سے مصالحت کی صورت میں ظالمانہ شرطوں کے قابل قبول نہیں ہونے کی صراحت امام محمدؒ کے یہاں ملتی ہے :

وإن كان حين طلب الذمه ، طلبها على أن يترك ، يحكم فى أهل مملكته بماشاء من قتل أو صلب أوغير ذلك مما لا يصلح فى أهل الإسلام لايجاب إلى ذلك ، فإن أعطي الصلح والذمة على هذا ، بطل من شروطه مالا يحل في الاسلام ۔ (۳)

---

(۱) مسلم، حدیث نمبر:۴۹۔

(۲) مجمع الزوائد:۱۲۰/۸، باب ماجاء في أذى الجار۔

(۳) السير الصغير:۲۹-۳۰، باب صلح الملوك والموادعة۔

غرض کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی اشتراک درست ہے؛ البتہ سیاسی اشتراک خود مسلمانوں کا باہمی طور پر ہو یا مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ہو، اس کا مقصد صرف اقتدار میں ساجھے داری نہ ہو؛ بلکہ انصاف کو قائم کرنا اور ظلم کو روکنا مقصود ہو۔

مذہبی تعلقات

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کے سلسلہ میں سب سے اہم موضوع مذہبی تعلقات کا ہے، اس سلسلہ میں تعلیمات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کے معاملہ میں دو باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں، اپنے دین پر استقامت اور دوسروں کے مذہبی جذبات کا احترام، ان دونوں نکات کی کسی قدر وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

شریعتِ اسلامی پر عمل

مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں، مسلم ممالک میں یا غیر مسلم ممالک میں، دین کے چار شعبوں میں ان کے لئے قانونِ شریعت کا التزام ضروری ہے، اعتقادات، عبادات، احوالِ شخصیہ اور معاملات۔

''اعتقادات'' سے مراد وہ احکام ہیں، جن کا تعلق قلب وضمیر سے ہو، جیسے: توحید، رسالت، آخرت کا یقین وغیرہ۔

''عبادات'' سے وہ احکام مراد ہیں، جن کا تعلق براہِ راست خدا اور بندے کے باہمی ارتباط سے ہے، جیسے: نماز، روزہ وغیرہ۔

''احوالِ شخصیہ'' سے مراد (Personal Law) ہے، اس میں نکاح، طلاق کے علاوہ میراث، وصیت اور مختلف اقارب سے متعلق حقوق وفرائض بھی آجاتے ہیں۔

''معاملات'' سے مراد مالی بنیاد پر دو افراد کے تعلقات ومعاہدات ہیں: تجارت، اجارہ، ہبہ وغیرہ اس شعبہ کے تحت آجاتے ہیں اور سود وقمار جیسے حرام معاملات بھی اسی دائرہ میں ہیں۔

یہ تمام قوانین وہ ہیں کہ چاہے مسلم اکثریت ملک ہو یا غیر مسلم اکثریت ملک اور کلیدا قتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو یا نہیں ہو، مسلمانوں کے لئے ان قوانین میں شریعتِ اسلامی کی اطاعت واجب ہے؛ البتہ جو قوانین اجتماعی نوعیت کے ہیں، یا جرم وسزا سے متعلق ہیں جیسے حدود، قصاص، نظام مملکت وغیرہ، ان شعبوں سے متعلق شرعی قوانین وہیں قابل نفاذ ہیں، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور باگِ اقتدار ان کے ہاتھوں میں ہو، جمہور کا مسلک یہی ہے اور یہی نقطۂ نظر امام محمدؒ کا ہے(۱)؛ البتہ امام اوزاعیؒ امیر جیش کو اپنے فوجیوں پر اجراء حد کی اجازت

(۱) دیکھئے: کتاب السیر والخراج والعشر، باب إقامة الحدود: ۱۴۰۔

دیتے ہیں(۱)، پس غیر مسلموں سے تعلقات مذکورۃ الصدر قوانین پر عمل آوری کے حق سے دست برداری اور محرومی کی قیمت پر استوار نہیں کئے جاسکتے۔

اپنی شناخت کی حفاظت

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ اسلام مسلمانوں سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے اپنے وجود کو دوسروں کے ساتھ گم نہ کرلیں؛ بلکہ اپنی شناخت اور پہچان کو باقی رکھیں، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے دوسری اقوام کی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے، حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے مروی ہے :

لیس منا من تشبہ بغیرنا ، لاتشبھوا بالیھود ولا بالنصاری الخ ۔(۲)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو دوسروں کی مشابہت اختیار کرے، وہ ہم میں سے نہیں، یہودیوں اور عیسائیوں سے مماثلت اختیار نہ کرو۔

اس تشبہ اور مماثلت کے چار مدارج ہوسکتے ہیں :

(الف) دوسری قوموں کے مذہبی شعائر میں مماثلت اختیار کی جائے، جیسے مسلمان صلیب یا زنار پہننے لگیں، یا سکھوں کے جو مخصوص شعائر ہیں ان کو استعمال کریں —— فقہاء نے اسے باعثِ کفر قرار دیا ہے، مجوسی خاص قسم کی ٹوپی پہنا کرتے تھے، فقہاء نے اس پر کفر کا حکم لگایا ہے ''**ولو وضع علی رأسه قلنسوة المجوس کفر**''۔(۳)

اسی طرح کی بات فقہاء کے یہاں زنار کے بارے میں بھی ملتی ہے، ہندوستان میں قشقہ لگانے کا حکم بھی یہی ہے؛ کیوں کہ وہ ہندو بھائیوں کے مذہبی شعائر میں ہے۔

(ب) غیر مسلم مذہبی تہواروں میں شرکت، یہ اگر یونہی ہو، یا اس کا مقصد اپنے گمان کے مطابق رواداری ہو، تو حرام ہے اور اگر ان کے مذہبی معتقدات اور افعال پر خوشنودی و رضامندی کا اظہار اور تائید و تحسین مقصود ہو تو کفر ہے ''**إنما الرضا بالکفر مستحسنا کفر**''(۴) کیوں کہ آدمی جس مذہب پر عقیدہ نہ رکھتا ہو اور اپنے عقیدہ کے مطابق اس کو نادرست خیال کرتا ہو، اس میں شرکت اور اس پر رضامندی وخوشنودی کا اظہار کھلی ہوئی دوعملی اور نفاق کی بات ہے، اس لئے اسلام نہ مسلمانوں کے لئے اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ ایسا منافقانہ رویہ اختیار کریں اور نہ غیر مسلموں سے خواہش کرتا ہے کہ وہ اسلامی شعائر کو اختیار کریں اور مسلمانوں کے مذہبی تہواروں میں شریک ہوں۔

---

(۱) دیکھئے: موسوعة فقه الإمام الأوزاعیؒ: ۲۹۵۔

(۲) ترمذی، حدیث نمبر: ۲۶۹۵، کتاب الاستیذان۔

(۳) الملتقط فی الفتاویٰ الحنفیة: ۲۴۵۔ (۴) الملتقط: ۲۴۵۔

(ج) تیسرا درجہ تہذیبی تشبہ کا ہے، یعنی ایسی وضع قطع اور لباس جو کسی خاص قوم کی شناخت بن گئی ہو اور اس کا مذہب سے تعلق نہ ہو، کو اختیار کرنا، جیسے ہندوستان میں دھوتی کہ اس کا مذہب سے تعلق نہیں؛ لیکن یہ ہندو بھائیوں کی پہچان سی بن گئی ہے، اگر کسی کو دھوتی میں ملبوس دیکھا جائے تو ذہن اسی طرف جاتا ہے کہ وہ ہندو ہے، ایسی مشابہت اور مماثلت اختیار کرنا مکروہ تحریمی ہے، علامہ ابن تیمیہؒ نے اس قسم کے تشبہ پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔(۱)

لیکن تشبہ کی اس جہت میں تبدیلی آتی رہتی ہے؛ کیوں کہ اگر کوئی وضع ایک عہد میں کسی قوم کی پہچان بن گئی ہو اور بعد کو اس کا استعمال عام ہو جائے اور وہ کسی خاص مذہبی گروہ کی شناخت باقی نہ رہ جائے، تو پھر تشبہ کی کیفیت ختم ہو جائے گی اور اس کا استعمال جواز کی حد میں آجائے گا، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے کوٹ، پینٹ کے بارے میں (۲) اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے ساڑی کے متعلق یہی لکھا ہے۔(۳)

(د) جو ملبوسات، وضع قطع اور تقریبات کسی خاص مذہبی گروہ کی پہچان نہیں ہیں، یا انتظام وانصرام سے متعلق اُمور جیسے طرزِ تعمیر، دفتری نظم ونسق، تجارتی طور وطریق وغیرہ، ان میں غیر مسلم بھائیوں کے طریقۂ کار سے استفادہ کرنے میں کچھ حرج نہیں، حضرت عمرؓ نے حساب وکتاب کے نظام میں روم وایران کے طریقوں سے استفادہ کیا تھا (۴) آپ ﷺ نے غزوۂ احزاب میں حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ پر اہل فارس کے طریقہ پر خندق کھدوائی تھی۔(۵)

یہ اس بات پر دلیل ہے کہ ایسے اُمور میں غیر مسلم بھائیوں کے تجربات سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں۔

غیر مسلموں سے تشبہ کی ممانعت فقہاء کے یہاں متفق علیہ ہے، اگر چہ امام محمد اور امام اوزاعیؒ کے یہاں تشبہ کی مختلف صورتوں کے بارے میں اتنی تفصیل نہیں ملتی، جس کا میں نے ذکر کیا؛ لیکن اُصولی طور پر اس کی ممانعت فقہاء کے یہاں متفق علیہ ہے۔

تشبہ اور مماثلت سے بچنے کا جو اُصولی حکم شریعتِ اسلامی میں دیا گیا ہے، وہ تعصب اور تنگ نظری پر مبنی نہیں ہے؛ بلکہ اس کا مقصد تہذیبی ہمہ رنگی کو برقرار رکھنا ہے، اسی لئے وہ دوسری قوموں سے بھی اس بات کا مطالبہ نہیں کرتا کہ وہ مسلمانوں کی وضع قطع کو اختیار کریں۔

اصل یہ ہے کہ شناخت کی حفاظت ایک فطری عمل ہے، غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی صورت اور آواز کو ایک دوسرے سے ممتاز رکھا ہے، انسان کے اندر شناخت کی حفاظت کا جذبہ اتنا اتھاہ ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم اپنی

(۱) دیکھئے: اقتضاء الصراط المستقیم: ۹۴/۱۔ (۲) امداد الفتاویٰ: ۲۶۸/۴، سوال نمبر: ۳۴۵۔
(۳) کفایة المفتی: ۱۶۱/۹۔ (۴) الفاروق: ۱۳۰/۲۔
(۵) البدایة والنهایة: ۹۵/۴۔

شناخت الگ رکھنا چاہتی ہے، اپنے تمدن کی حفاظت کرتی ہے، اپنے جھنڈے الگ رکھتی ہے، ہر اسکول اپنا مستقل یونیفارم رکھتا ہے، گورنمنٹ کے مختلف محکموں کے الگ الگ یونیفارم ہوتے ہیں، اس لئے اپنی شناخت کی حفاظت کوئی مذموم عمل نہیں ہے اور نہ اس میں دوسروں کی مخالفت اور ان کے بارے میں تنگ نظری ہے، اسلام چاہتا ہے کہ مسلمان اپنی پہچان کو باقی رکھیں اور جہاں اسلامی نظام نافذ ہو، وہاں غیر مسلم بھائیوں کو بھی اس بات کی پوری آزادی فراہم کی جاتی ہے کہ وہ اپنی مذہبی وتہذیبی شناخت کے ساتھ زندگی گذاریں۔

دوسرے مذاہب کا احترام اور عدم مداخلت

مذہبی تعلقات کی دوسری بنیاد دوسرے مذاہب کا احترام اور ان کے مذہبی اُمور میں عدم مداخلت ہے، قرآنی تعلیمات کا نچوڑ عقیدۂ توحید کی دعوت ہے، اسلام میں توحید سے زیادہ کوئی چیز مطلوب ومحمود نہیں اور شرک سے زیادہ کوئی چیز قابل ترک اور مذموم نہیں؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے حد درجہ مذہبی رواداری کی تعلیم دی ہے، قرآن مجید نے صاف کہا ہے کہ ہر شخص کو عقیدہ کی آزادی حاصل ہے اور کسی مذہب کے قبول کرنے کے لئے جبر وتشدد جائز نہیں :

لَا اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۔ (البقرۃ:۲۵۶)

دین میں کوئی جبر نہیں، ہدایت گمراہی کے مقابلہ واضح ہو چکی ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا :

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۔ (یونس:۹۹)

کیا آپ لوگوں کو اس بات پر مجبور کردیں گے کہ وہ ایمان لائیں؟

حضرت عمرؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ انھوں نے اپنے وسق نامی غلام سے بار بار خواہش کی کہ وہ اسلام قبول کرلے، آپؓ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر تم اسلام قبول کرلو تو تمہیں مسلمانوں کی امانت کی کوئی ذمہ داری سونپوں گا؛ لیکن وسق اس سے ہمیشہ انکار کرتا رہا، حضرت عمرؓ ہمیشہ اس کے جواب میں فرماتے ''لَا اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ '' یہاں تک کہ وفات کے قریب آپؓ نے اس کو آزاد کردیا۔(۱)

اسی لئے فقہاء متفق ہیں کہ کسی شخص کا اسلام قبول کرنا ایک اختیاری عمل ہے، اس پر کسی کو مجبور نہیں کیا جاسکتا، امام اوزاعیؒ نے لکھا کہ بالغ، عاقل، مختار شخص کا ہی اقرار شہادتین معتبر ہے، اس کے بغیر اگر کوئی شخص خوف سے بعض اسلامی اعمال کو کرنے لگے، تو اس کا شمار مسلمانوں میں نہیں ہوگا، یعنی اگر اس کے بعد وہ کافروں کے سے افعال کرنے لگے تو وہ مرتد نہیں شمار کیا جائے گا اور حد ارتداد اس پر جاری نہیں کی جائے گی :

(۱) كتاب الأموال:۱/۱۵۴۔

يصير المرء البالغ العاقل المختار مسلما بالنطق بالشهادتين إجماعاً ، ولكنه لا يصير مسلما بفعله أفعال المسلمين كالصلاة والحج وغيرهما ، قالؒ : إن أم الكافر المسلمين وهم لا يعلمون ، فعليهم إعادة الصلاة ، وصلاته هذه لا تكون إسلاما إذا لم يتكلم بالإسلام قبل الصلاة ، وقال : إن صحب الكافر المسلمين ، فصلى معهم ، ثم ترک الصلا ة ، وقال : إنما صليت لأني خفت على نفسي لا يقتل بذلک ، لأنه لا يصير مسلماً بالصلاة ۔ (۱)

مذہب پر عمل کی آزادی

عقیدہ کے علاوہ غیر مسلموں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی بھی مکمل آزادی حاصل ہے، قرآن مجید نے صاف طور پر حضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے مشرکین مکہ کو کہلایا ہے ''لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ''(الکافرون:۶) ''تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین'' ایک اور موقع پر ارشاد ہے ''لَنَا اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ''(الشوریٰ:۱۵) ''ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال'' رسول اللہ ﷺ کی رواداری کا حال یہ تھا کہ نجران کے عیسائیوں کا وفد بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوا، تو آپ نے ان کو ان کے مذہب کے مطابق اور ان کے قبلہ کی طرف رُخ کر کے مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔(۲)

فقہاء نے لکھا ہے :

> اگر کسی مسلمان کی بیوی یہودی یا عیسائی ہو اور اس کے عقیدہ کے مطابق کسی خاص دن روزہ رکھنا واجب ہو تو مسلمان شوہر اسے روزہ رکھنے سے روک نہیں سکتا ہے، گو اس کی وجہ سے وہ جنسی استفادہ کے حق سے محروم ہوتا ہے۔(۳)
>
> اسی طرح اگر وہ اپنے عقیدہ کے مطابق صلیب پہنے، یا مسلمان شوہر کے گھر میں صلیب رکھے تو اسے یہ حق ہے اور شوہر اس کو اس سے روک نہیں سکتا۔(۴)

---

(۱) موسوعة فقه الإمام الأوزاعیؒ:۱۵۱۔

(۲) أحكام أهل الذمة:۳۱۶/۱۔

(۳) أحكام أهل الذمة:۳۱۶/۱۔

(۴) أحكام أهل الذمة:۳۱۶/۱۔

امام محمدؒ نے بھی اس سلسلے میں بعض اُمور کی صراحت کی ہے، مثلاً :

وكذلك ضرب الناقوس لم يمنعوا منه إذا كانوا يضربونه في جوف كنائسهم القديمة فإن أرادوا الضرب بها خارجا ، فليس ينبغي أن يتركوا ليفعلوا ذلك لما فيه من معارضة اذان المسلمين في الصورة ، فاما كل قرية أو موضع ليس بمصر من أمصار المسلمين فإنهم لا يمنعون من إحداث جميع ذلك فيها وإن كان فيها عدد من المسلمين نزول ۔(۱)

مذہبی مقدس شخصیتوں کو برا بھلا نہ کہا جائے

یہ بھی ضروری ہے کہ دوسرے مذہبی گروہوں کے مذہبی جذبات کو مجروح نہ کیا جائے اور دوسری قومیں جن دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش کرتی ہوں، ان کو برا بھلا نہ کہا جائے ؛ حالاں کہ یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام خدا کی ذات وصفات میں کسی کی شرکت کو جائز نہیں سمجھتا ؛ کیوں کہ یہ سچائی اور واقعہ کے خلاف ہے ؛ لیکن پھر بھی مذہبی رواداری کے تحت ان معبودانِ باطل کے بارے میں ناشائستہ باتیں کہنے سے منع کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

لاَ تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ ۔ (الانعام:۱۰۸)

وہ اللہ کے سوا جن کی عبادت کرتے ہیں تم ان کو برا بھلا نہ کہو۔

مذہبی شخصیتوں کے احترام کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مذہبی پیشواؤں جیسے راہبوں کو جنگ کے دوران بھی قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے، چنانچہ امام اوزاعیؒ کا نقطۂ نظر اس طرح منقول ہے :

لا يجوز قتل الرهبان فى الحرب الا ان يكون لهم ضلع فيها ۔(۲)

عبادت گاہوں کا احترام

اسی طرح عبادت گاہوں کے معاملات میں بھی تمام اہل مذاہب کے جذبات کو ملحوظ رکھنے کی ترغیب دی گئی ہے، قرآن مجید نے جہاں عبادت گاہوں کے منہدم کرنے کی مذمت کی ہے، وہاں مسلمانوں کی مسجدوں سے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں کے گرجوں کا ذکر فرمایا ہے، (الحج:۴۰) اس سے ظاہر ہے کہ عبادت گاہوں —— خواہ کسی مذہب کی ہوں —— ان کا احترام ملحوظ رکھنا چاہئے، رسول اللہ ﷺ نے بنو نجران سے جو معاہدہ کیا اس میں یہ صراحت

(۱) شرح السير الكبير:۲۵۲/۳۔

(۲) موسوعة الإمام الأوزاعيؒ ، ماده : راهب۔

فرمائی کہ ان کی عبادت گاہیں منہدم نہیں جائیں گی اور نہ مذہبی اُمور میں کوئی مداخلت کی جائے گی (۱) عہدِ صدیقی میں حضرت خالد بن ولیدؓ کے ذریعہ حیرہ کا علاقہ فتح ہوا، اہل حیرہ کے لئے انھوں نے جو دستاویز تیار فرمائی، اس میں بھی یہ صراحت موجود ہے کہ ان کے چرچ اور گرجے منہدم نہیں کئے جائیں گے، امام ابو یوسفؒ نے اسے نقل کیا ہے۔ (۲)

فقہاء کے یہاں بھی اس کی صراحت ملتی ہے؛ چنانچہ امام اوزاعیؒ کا نقطۂ نظر یہ ہے :

لا يجوز قطع أشجار العدو ولا تحريقها ولا هدم بيته ولا كنائسه ولا بنيانه إلا أن يتخذها معاقل له يرمينا منها ۔ (۳)

بلکہ فقہاء نے بعض شرائط اور حدود و قیود کے ساتھ مسلمان ملک کے غیر مسلم شہریوں کو اپنی عبادت گاہ تعمیر کرنے کی بھی اجازت دی ہے؛ چنانچہ امام محمدؒ کا بیان ہے :

..... **فإن عطل المسلمون هذا المصر حتى تركوا إقامة الحدود والجمع فيها ، فلإهل الذمة أن يتخذوا فيها ما أرادوا من الكنائس وأن يظهروا بيع الخمر والخنزير فيها ۔ (۴)**

اسی طرح جو قدیم عبادت گاہیں ہوں، ان کی تعمیر نو بھی جائز ہوگی، بقول امام محمدؒ :

فإن انهدمت كنيسة من كنائسهم القديمة ، فلهم أن يبنوها كما كانت ۔ (۵)

اسی طرح پہلے سے ان کی جو عبادت گاہیں قائم ہوں، اگر وہاں غالب آبادی غیر مسلموں کی ہو، تو وہ عبادت گاہیں باقی رہیں گی؛ بلکہ ان کو نئی عبادت گاہیں بنانے کی بھی اجازت ہوگی؛ چنانچہ امام محمدؒ فرماتے ہیں :

فأما المصر الذى الغالب عليه أهل الذمة مثل الحيرة وغيرها ليست فيها جمعة ولا حدود تقام ، فإنهم لا يمنعون من إحداث ذلك فيها ..... وإذا اشترى قوم من أهل الذمة فيها منازل ، واتخذوا فيها الكنائس والبيع وأعلنوا فيها بيع الخمر و الخنزير لم يمنعوا من ذلك ۔ (۶)

---

(۱) سنن أبي داود، حدیث نمبر: ۳۰۴۱۔ (۲) موسوعة الخراج: ۱۴۳۔

(۳) موسوعة فقه الإمام الأوزاعیؒ: ۲۹۲، فتح الباری: ۹۵/۶۔

(۴) شرح السير الكبير: ۲۵۷/۳۔

(۵) شرح السير الكبير: ۲۵۳/۳۔

(۶) شرح السير الكبير: ۲۵۲/۳۔

البتہ جزیرۃ العرب کا علاقہ اس سے مستثنیٰ ہے ؛ کیوں کہ اس کی حیثیت پوری ملت اسلامیہ کے ایمانی دارالخلافہ کی ہے؛اس لئے وہاں ایک سے زیادہ قبلہ کی گنجائش نہیں، چنانچہ امام محمدؒ رقمطراز ہیں :

وليس ينبغي أن يترک في أرض العرب كنيسة ولا بيعة ولا بيت نار فی شي ء من الأمصار والقرى ، وكذلک لا ينبغي أن يظهر فيها بيع الخمر والخنزير بحال من الأحوال ۔ (۱)

اس سلسلہ میں خلافتِ راشدہ اور بعد کے مسلم عہد میں بہت سی مثالیں موجود ہیں، جن کا ذکر اس وقت درازیٔ کلام کا باعث ہوگا؛ لیکن اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام عقیدۂ توحید کی حفاظت اور اپنی شناخت کی بقاء کے سلسلہ میں جس قدر حساس ہے، غیر مسلموں کے مذہبی اور سماجی مسائل میں اسی قدر کشادہ قلب، سیر چشم اور روادار بھی ہے، افسوس کہ اس پر غلط فہمیوں کے تہہ در تہہ دبیز پردے ڈال دیئے گئے ہیں۔

فوجی تعلقات

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان فوجی تعلقات بھی ہو سکتے ہیں، مسلمانوں کے لئے یہ بات جائز ہے کہ وہ غیر مسلموں سے جہاد میں مدد حاصل کریں ؛ بلکہ اگر اہل ذمہ سے مدد لی جائے ، تو مالِ غنیمت میں بھی مسلمان فوجیوں کے مساوی ان کا حصہ ہوگا، چنانچہ امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں :

لا أكره أن يستعان بأهل الشرک على قتال أهل الشرک إن كان حكم الإسلام هو الغالب الجاري عليهم ، وإنما يكره إن كان حكم الشرک هو الظاهر ، فإذا قاتل أهل الذمة مع المسلمين ، استحقوا من الغنيمة سهما كسهم المسلمين ۔ (۲)

یہی بات امام محمدؒ نے بھی لکھی ہے :

لا بأس بأن يستعين المسلمون بأهل الشرک على أهل الشرک إذا كان حكم الإسلام هو الظاهر عليهم ۔(۳)

اسی طرح اس بات کی بھی گنجائش ہے کہ اگر حربی غیر مسلموں کی اپنے مذہب کے لوگوں سے لڑائی ہو،

---

(۱) شرح السير الكبير:۲۵۷/۳۔

(۲) موسوعة فقه الإمام الأوزاعیؒ:۲۸۸،تفسير قرطبی:۱۸/۸۔

(۳) السير الكبير مع شرح السرخسی:۱۸۶/۳۔

تو مسلمان ان کی مدد کریں؛ البتہ اگر وہ کسی اور مسلمان ملک سے جنگ کر رہے ہوں، تو مسلمانوں کے لئے ان کے ساتھ جنگ میں تعاون کرنا جائز نہیں :

يجوز للأسير أن يقاتل مع العدو من خالفه من أهل ملته — أى ملة الكفر — ويفهم من هذا أنه لا يجوز له أن يقاتل المسلمين مع الكفار ، أما المسلم المستامن في ديار الكفر ، فلا يجوز له أن يقاتل مع الكفار إلا أن يشترطوا عليه ، إن غلبوا أن يردوه إلى دار الإسلام ۔(۱)

جولوگ اس کو درست قرار دیتے ہیں، ان کا استدلال اس بات سے ہے کہ مہاجرین حبشہ نے نجاشی کی فوج کے ساتھ اس جنگ میں شرکت کی تھی، جو اس کی اپنی ہی قوم سے واقع ہوئی تھی (۲) — البتہ امام محمدؒ کا رجحان اس طرف ہے کہ مسلمانوں کو دارالحرب کی حکومت کی مدد بہر حال نہیں کرنی چاہئے، چاہے وہ دوسرے غیر مسلم گروہ ہی کے مقابل کیوں نہ ہو۔(۳)

جہاد — حقیقت اور غلط فہمی

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات کے موضوع پر شکوک وشبہات کے کانٹے آج کل جس عنوان سے بوئے جاتے ہیں، وہ ہے ''جہاد'' جہاد کی ایسی تصویر پیش کی جاتی ہے کہ گویا ہر مسلمان تلوار تھامے گھر سے نکلتا ہے اور جس غیر مسلم کو پاتا ہے، اسے تہہ تیغ کر دیتا ہے، اسی لئے آج کل دہشت گردی اور جہاد کو ہم معنی الفاظ سمجھ لیا گیا ہے؛ حالاں کہ جہاد ایک قانونی عمل ہے اور دہشت گردی غیر قانونی عمل۔

جہاد تمام غیر مسلموں سے نہیں ہے؛ بلکہ ان غیر مسلموں سے ہے، جو مسلمانوں سے برسر پیکار ہوں؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا إِنَّ اللهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ۔ (البقرۃ :۱۹۰)

اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو، جو تم سے جنگ کر رہے ہیں اور حد سے تجاوز نہ کرو، بے شک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

---

(۱) موسوعة فقه الإمام الأوزاعیؒ:۲۸۹۔

(۲) دیکھئے:شرح السير الكبير:۱۸۶/۳،باب الاستعانة بأهل الشرك واستعانة المشركين للمسلمين۔

(۳) دیکھئے:كتاب السير:۱۸۱، باب القوم يكونون مستامنين في دار الحرب۔

اس آیت میں ''حد سے تجاوز کرنے'' کو منع کیا گیا ہے، حد سے تجاوز کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اول یہ کہ جو لوگ تم سے برسر پیکار نہ ہوں، تم بھی ان سے جنگ نہ کرو، دوسرے یہ کہ جب جنگ ہو تو انسانی تقاضوں اور جنگ کے مہذب قوانین کو ملحوظ رکھو، عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور معذوروں، نیز جنگ میں حصہ نہ لینے والوں اور مذہبی پیشواؤں پر ہاتھ نہ اُٹھاؤ کہ رسول اللہ ﷺ اور خلفاء راشدینؓ نے جنگ میں ان لوگوں کو نشانہ بنانے سے منع فرمایا ہے۔(۱)

ایک اور موقع پر قرآن مجید نے ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے جن سے جہاد کا حکم ہے کہا ہے :

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللهِ ۔(محمد:۱)

جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستہ سے روکا۔

قرآن مجید نے اس بات کو دوسری جگہ بہت ہی وضاحت سے کہا ہے :

أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ الَّذِيْنَ أُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّا اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللهُ ۔ (الحج:۴۰-۳۹)

ان لوگوں کو جو جنگ کر رہے ہیں، جنگ کی اجازت اس لئے دی گئی ہے کہ ان پر ظلم کیا گیا اور اللہ یقیناً ان کی مدد کرنے پر قادر ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو ناحق محض یہ کہنے کی وجہ سے کہ ہمارا رب اللہ ہے، اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ محض کفر کی وجہ سے جہاد کا حکم نہیں دیا گیا؛ بلکہ کفر کے ساتھ ساتھ ان کے ظلم وزیادتی اور جبر واستبداد کے سبب جہاد کا حکم فرمایا گیا، قرآن نے اس مضمون کو ایک سے زیادہ مواقع پر بہت ہی صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جو غیر مسلم حضرات مسلمانوں سے آمادۂ پیکار نہ ہوں اور صلح جو ہوں، مسلمانوں کو بھی ان کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھانا چاہئے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ۔ (النساء:۹۰)

اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں، پس تم سے جنگ نہ کریں اور تمہاری طرف صلح کی پیشکش کریں، تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان کے خلاف دست درازی کی کوئی گنجائش نہیں رکھی ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے :

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا ۔ (الانفال:۶۱)

اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لئے آمادہ ہو جاؤ۔

(۱) سنن أبي داود، حدیث نمبر:۲۶۱۴۔

ان آیات سے یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ جنگ، جنگجوؤں اور شدت پسندوں سے ہے نہ کہ صلح جوؤں اور امن پسندوں سے؛ بلکہ اگر کسی غیر مسلم گروہ سے امن کا معاہدہ ہو اور وہ کسی مسلمان گروہ کے درپے آزار ہوں، تو سیاسی طور پر اور پرامن طریقوں سے تو مسلمانوں کی مدد کی جائے گی اور سیاسی واخلاقی دباؤ ڈالا جائے گا؛ لیکن ان کے خلاف بھی قتال کرنا اور عہد کو توڑنا درست نہیں ہوگا، اس سلسلہ میں قرآن مجید کی یہ صراحت بہت ہی قابل توجہ ہے :

وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ وَّاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۔ (الانفال:۷۲)

اور اگر وہ (مسلمان) تم سے دین کے معاملہ میں مدد کے طلب گار ہوں، تو تم پر ان کی مدد کرنا واجب ہے؛ لیکن ایسی قوم کے خلاف نہیں کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہے ہیں۔

قرآن مجید کے ان ارشادات کو سامنے رکھ کر یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جہاد کا حکم کن لوگوں سے ہے؟ صرف ان لوگوں سے جو مسلمانوں سے جنگ کرنے پر تلے ہوئے ہوں، جن لوگوں سے مسلمانوں کا معاہدۂ امن ہو، یا جو لوگ غیر جانبدار ہوں، نہ ان سے جنگ ہو اور نہ ان سے کوئی معاہدہ ہو، ایسے لوگوں سے جہاد کا حکم نہیں دیا گیا اور یہ بات ظاہر ہے کہ یہ پوری طرح انصاف کے عمومی اُصول اور تقاضے کے مطابق ہے کہ ظالموں کا پنجہ تھاما جائے اور انھیں ظلم سے باز رکھا جائے، جو لوگ مسلمانوں سے جنگ نہ کرتے ہوں اور انھیں مشرکین مکہ کی طرح وطن سے بے وطن ہونے پر مجبور نہ کررہے ہوں، ان کے ساتھ جنگ کے بجائے حسن سلوک اور صلح وآشتی کا حکم دیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے :

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْا فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ ، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۔ (الممتحنة:۸)

جو لوگ تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کرتے ہیں اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکال رہے ہیں، اللہ تعالیٰ تم کو ان کے ساتھ بہتر سلوک کرنے اور انصاف کرنے سے نہیں روکتے، بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔

قرآن مجید کے ان بیانات کی روشنی میں فقہاء اسلام خصوصاً امام اوزاعیؒ اور امام شیبانیؒ کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے :

(۱) اہل ذمہ سے قتال جائز نہیں؛ کیوں کہ ہمارا ان سے معاہدہ ہوچکا ہے، یہاں تک کہ امام محمد کا خیال

ہے کہ اگر اہل ذمہ کا کوئی گروہ نقض عہد پر اتر آئے؛ لیکن مسلمان وہاں مامون ہوں، تو ان کو قابو میں تو کیا جائے گا؛ لیکن ان کے ساتھ محاربین کا سا سلوک نہیں کیا جائے گا :

قلت : أرأيت القوم من أهل الذمة إذا نقضوا العهد وحاربوا المسلمين وغلبوا على مدينتهم ، فكان حكمهم فيها جائز ، غير أن فيها ناسا من المسلمين آمنين ، فظهروا عليهم ، هل تسبيهم ؟ قال : لا ، قلت : لم ؟ قال : لأن الدار لم تصر دار حرب ، ألا ترى أن المسلمين فيها آمنون ، وهي دار الإسلام التي كانت عليها ، يعد على حالها ۔(۱)

(۲) امام محمدؒ کی صراحت کے مطابق محاربین سے تینوں قسم کی شرطوں پر صلح کی جاسکتی ہے :

(الف) نہ مسلمان غیر مسلموں کو کچھ ادا کریں، نہ غیر مسلم مسلمان کو، کچھ لئے دیئے بغیر صلح ہوجائے۔

(ب) غیر مسلم مسلمانوں کو معاہدہ کے مطابق بدل صلح ادا کریں۔

(ج) مسلمان غیر مسلم ممالک کو صلح کا بدل ادا کریں۔

بہر حال جو بھی صورت ہو، جب تک معاہدہ باقی ہے، مسلمانوں کے لئے ان پر حملہ کرنے کی گنجائش نہیں :

والموادعة التي جرت بين الفريقين ، فان قتالهم بعد ها من غير نبذ يكون غدراً للأمان ، وذلك حرام ۔ (۲)

اگر کسی وجہ سے معاہدہ باقی نہیں رکھا جاسکتا، تب بھی مسلمان ملک کا فریضہ ہے کہ وہ اس معاہدہ کے ختم ہونے کی باضابطہ طور پر اطلاع کردے اور جب تک دشمن ملک اس سے واقف نہ ہوجائے، اس وقت تک حملہ نہ کیا جائے، چنانچہ امام محمدؒ نے لکھا ہے :

ولو بدا للإمام بعد الموادعة أن القتال خير ، فبعث إلى ملكهم ينبذ اليه ، فقد صار ذلك نقصاً ..... ولكن لا ينبغي للمسلمين أن يغيروا عليهم ولا على أطراف مملكتهم حتى يمضي من الوقت مقدار ما يبعث الملك إلى ذلك الموضع من ينذرهم ..... وبعد المضي لا بأس بالإغارة عليهم وإن لم يعلم المسلمون أن الخبر أتاهم ، ولكن إن علم المسلمون يقينا أن القوم لم ياتهم خبر ، فالمستحب لهم أن

(۱) كتاب السير والخراج والعشر:۲۰۰،باب نقض اهل الذمة۔

(۲) شرح السير الكبير:۱۶/۴۔

لا يغيروا عليهم حتى يعلموهم ۔(۱)

اوراگر مسلمان ملک نے صلح کرنے والے ملک سے صلح کے بدلہ میں کچھ مال حاصل کیا تھا،تو یہ بھی ضروری ہے کہ جو مدت ابھی باقی ہو،اس کا بدلِ صلح واپس کردے :

وإن كانت الموادعة على جعل ، فله أن ينقضها متى شاء أيضا ، ولكن يرد عليهم بحصة مابقي من المدة من الجعل حتى لو وادعهم ثلاث سنين على ثلاثة آلاف دينار و قبضها كلها ، ثم أراد نقض الموادعة بعد سنة ، فعليه رد ثلثي المال ۔(۲)

نیز جس ملک سے معاہدہ امن ہو،اگر وہاں کی حکومت نے معاہدہ شکنی نہیں کی ؛لیکن کچھ افراد نے اپنے طور پر مسلمانوں پر حملہ کیا،تو یہ ان کی طرف سے نقض معاہدہ نہیں سمجھا جائے گا اور مسلمانوں کے لئے اس حکومت پر حملہ کرنا درست نہیں ہوگا،جیسا کہ امام محمدؒ نے لکھا ہے :

وإذا وادع الإمام أهل دار الحرب فخرج رجل من أهل تلك الدار ، فقطع الطريق في دار الإسلام وأخاف السبيل فأخذه المسلمون ، فليس هذا بنقض منه للعهد ، وكذلك العدد منهم إذا فعلوا ذلك ولم يكونوا أهل منعة ، فهذا والواحد سواء ، فإن كانوا أهل منعة فعلوا ذلك في دار الإسلام علانية بغير أمر من ملكهم وأهل مملكته ، فهولاء ناقضون للعهد فاما الملك وأهل مملكته ، فهم على موادعتهم ، وإن كانوا خرجوا بإذن ملكهم ، فقد نقضوا جمعياً العهد ، فلا باس بقتلهم وسبيهم حيثما وجدوا ۔(۳)

مسلمان فقہاء نے موادعین کے بارے میں اس قدر فراخ دلی سے کام لیا ہے کہ جاسوسی کو بھی نقض عہد قرار نہیں دیا ہے :

..... فإن صار ذمة ، ثم وقف منه على أنه يخبر المشركين بعورة المسلمين ويواري عيونهم لم يكن هذا نقضاً منه للعهد ولكنه يعاقب على هذا ويحبس ۔(۴)

---

(۱) السير الكبير مع شرح السرخسی:۴/۷۔ (۲) شرح السير الكبير:۴/۱۵۔

(۳) السير الكبير مع شرح السرخسی:۴/۶۔ (۴) السير الصغير:۳۰،باب صلح الملوك والموادعة۔

(۳) البتہ دارالحرب (دشمن ملک) جس کا مسلمانوں سے کوئی معاہدہ نہ ہو، سے جہاد کرنا جائز ہے، اس سلسلے میں امام اوزاعی نے لوگوں کی تین قسمیں کی ہیں اور ان کے الگ الگ احکام بیان کئے ہیں، ڈاکٹر رواس قلعہ جی نے ان کے افکار کا خلاصہ اس طرح ذکر کیا ہے :

الشعوب من حيث اديانها على ثلا ثة انوا ع ، شعوب مسلمة ، قد جعل الله تعالىٰ الحاكمية لها عندما قال فى سورة النساء : ۱۴۱ "ولن يجعل الله للكافرين على المومنين سبيلاً " وشعوب لها أنبياء معرفون و شرائع معروفة — ضاع بعضها وحرف بعضها وما بقي من أُصولها ، فهو القليل — وهذه الشعوب لا يجوز قتالها إلا أن يخشى منها الغدر عملاً بقوله تعالىٰ في سورة الأنفال : ۵۸" وإما تخافن من قوم خيانة فانبذ إليهم على سواء " وشعوب ليس لها أنبياء يعرفون ولا أثر من شرائع باقية ، كالفرازنة والترک وعبدة الأصنام والهنود وكل جاحد ومكذب بربوبية الله تعالىٰ وهٰولاء يقاتلون — إنقاذا لهم مما فيه من الضلال وتحريراً لعقولهم — حتى يسلموا أو يعطو الجزية ، فإن بذلو الجزية ، قبلت منهم ، وكانوا كالمجوس في تحريم مناكحتهم وذبائحهم و سائر أمورهم ۔(۱)

یہ بات قابل لحاظ ہے کہ عین جنگ کے ماحول میں بھی اسلام نے مسلمانوں کو مہذب اور منصفانہ قانون کا پابند بنایا ہے، اس سلسلے میں چند نکات یہاں ذکر کئے جاتے ہیں، جن کی امام اوزاعیؒ یا امام محمدؒ نے صراحت کی ہے۔

اگر فریقین کے درمیان اس طور پر جنگ بندی ہوئی ہو کہ مسلمانوں نے دشمن طاقت سے کچھ افراد کو بطور ضمانت کے اپنے قبضے میں لیا ہو، تو چاہے دشمن دھوکہ دے؛ لیکن مسلمان اپنے عہد پر قائم رہیں گے اور انھیں قتل نہیں کریں گے۔

..... ان أخذ المسلمون من العدو رهائن ، فغدر العدو ، قال الأوزاعي : لا تقتل الرهائن بغدرهم ۔(۲)

یہاں تک کہ امام محمد نے صراحت کی ہے کہ اگر دشمن طاقت نے ہمارے رہائن کو قتل کر دیا ہو، تب بھی

---

(۱) موسوعة فقه الإمام الأوزاعیؒ:۲۸۷۔

(۲) موسوعة فقه الإمام الأوزاعی:۲۹۵،كتاب الأموال ، لأبي عبيد :۱۶۲۔

ہمارے لئے جائز نہیں ہے کہ ہم ان کے رہائن کو قتل کردیں، چنانچہ فرماتے ہیں :

فإن غدر المشركون وقتلوا رهن المسلمين ثم قتل المسلمون رهنهم اعتمادا على ظاهر الشرط فقد أخطأ وا فى ذلک ؛ لانهم كانوا مستامنين فينا ، و ينبغي لمن قتلهم أن يغرم دياتهم كما هو الحكم في المسلم يقتل المستامن ۔(۱)

جن لوگوں کا جنگ سے براہ راست تعلق نہ ہو یا وہ جو جنگ میں حصہ لینے سے عاجز ہوں، جنگ میں بھی ان کو قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے، چنانچہ اس سلسلے میں امام اوزاعی کے نقطۂ نظر کو ان الفاظ میں سمجھا جاسکتا ہے :

ولا يقتل في الحرب السكان الآمنون الذين لا ضلع لهم في الحرب ، ومنهم الذين يحرثون الأرض ويزرعونها ، والشيخ الكبير والمجنون ، والراهب والمرأة والصغار مالم يقاتلوا ، فمن قاتل من هولاء يقتل ، ولا يقتل من يدعى الحصول على الأمان ، فإن ادعىٰ الكافر أنه قد امن او قال لمن أخذه ، انما وقفت لندائک ، فهو آمن ، فان لم يد ع ذلک ، فلا يقبل ۔(۲)

اسی طرح امام محمدؒ نے امام ابوحنیفہؒ کے حوالہ سے نقل کیا ہے :

سألت أبا حنيفة عن قتل النساء والصبيان والشيوخ الذين لا يقدرون على القتال والذين بهم زمانة ، لا يطيقون قتالاً ، فنهى عن ذلک وكرهه ۔ (۳)

ایک اور موقعہ پر امام محمدؒ نے لکھا ہے :

ولا يقتل الأعمىٰ والمقعد والمعتوه من الأسرى ۔(۴)

اسی طرح عین جنگ کے درمیان بھی انسانی پہلو کو ملحوظ رکھا جائے گا، من جملہ اس کے یہ ہے کہ مقتولین کی لاش برہنہ نہیں کی جائے گی؛ چنانچہ امام اوزاعیؒ کے بارے میں منقول ہے :

قد قيل له : أيتركون عراة ؟ فقال أبعد الله عورتهم وكره أن يتركوا عراة ۔(۵)

---

(۱) شرح السير الكبير:۵۲/۴۔ (۲) موسوعة فقه الإمام الأوزاعیؒ:۲۹۱۔

(۳) السير الصغير:۵۸۔ (۴) السير الصغير:۲۰۔

(۵) موسوعة فقه الإمام الأوزاعیؒ:۲۴۵۔

اسی طرح دشمن کے علاقہ کے درخت اور باغات بلاوجہ کاٹنا یا جلانا جائز نہیں، چنانچہ امام اوزاعی فرماتے ہیں :

لا يجوز قطع أشجار العدو ولا تحريقها ۔(۱)

اسی طرح بلاوجہ دشمن کے جانور کو مار ڈالنا اور ذبح کر دینا بھی درست نہیں؛ چنانچہ امام اوزاعی کا نقطۂ نظر ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے :

لا يجوز عقر حيوان العدو لمجرد مغايظة العدو أو إلا فساد عليهم ويجوز عقره للأكل ، قال : نهى أبوبكر أن تعقر بهيمة إلا لماكلة ، وأخذ بذلك أئمة المسلمين وجماعتهم ، حتى إن علماء هم كانوا يكرهون للرجل ذبح الشاة والبقرة ليأكل طائفة منها ويدع سائرها ۔(۲)

حیاتِ نبوی ﷺ اور جہاد

مستشرقین کے پروپیگنڈوں کے پس منظر میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہندوستان کے ایک معتبر سیرت نگار کے بیان کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی مدنی زندگی میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تصادم کے کل بیاسی (۸۲) واقعات پیش آئے ہیں اور زیادہ تر جنگیں مدینہ کے قریب ہوئی ہیں، جو اس بات کی علامت ہے کہ اس میں مسلمان حملہ آور نہیں تھے، ان بیاسی واقعات میں کل ایک ہزار اٹھارہ افراد دونوں طرف سے کام آئے اور اوسطاً ایک جنگ میں گیارہ جانیں گئیں، یہی وہ تعداد ہے جس کی وجہ سے اسلام کے بارے میں غلط فہمی پھیلائی جاتی ہے کہ اسے تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے، جب کہ مہابھارت کی مقدس جنگ میں لاکھوں افراد خود ہندو مذہبی مآخذ کے مطابق مارے گئے اور عیسائی مذہبی عدالت کے حکم پر ایک کروڑ بیس لاکھ افراد کو سزائے موت دی گئی اور ان میں ایک بہت بڑی تعداد وہ تھی جن کو زندہ جلا دیا گیا؛ لیکن افسوس کہ مغربی اقوام جن کی پوری تاریخ غارت گری، خوں آشامی اور استعماریت کی داستانوں سے بھری ہوئی ہے، انھوں نے ''چور مچائے شور'' کے مصداق بڑی ہوشیاری کے ساتھ مسلمانوں کی تاریخ پر لکھ دیا :

بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

جزیہ کی حقیقت

اسلام کو بدنام کرنے کے لئے جزیہ کے مسئلہ کو بھی اُٹھایا جاتا رہا ہے، اہل علم نے تفصیل سے اس کا جواب دیا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ جزیہ سے مراد وہ خصوصی ٹیکس ہے جو اسلامی حکومت غیر مسلم رعایا سے ان کی جان و مال کی

(۱) موسوعة فقه الإمام الأوزاعیؒ:۲۹۲۔ (۲) موسوعة فقه الإمام الأوزاعیؒ:۲۹۲۔

حفاظت کے طور پر وصول کرتی ہے، صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمانوں پر زکوٰۃ واجب ہے، جسے حکومت وصول کرتی ہے، اگر غیر مسلموں پر بھی زکوٰۃ واجب قرار دی جاتی، تو یہ انھیں ایک اسلامی عمل پر مجبور کرنے کے مترادف اور مذہبی آزادی کے مغائر ہوتا، اس لئے ان پر ایک جداگانہ ٹیکس ''جزیہ'' کے نام سے لگایا گیا، جو ان کی جان ومال کے حفاظتی نظام کا معاوضہ ہے، یہ ان کے حالتِ کفر میں ہونے کا تاوان نہیں، اگر ایسا ہوتا تو عورتوں، بچوں، بوڑھوں، بیماروں، معذوروں، بے روزگاروں اور ان سے بڑھ کر مذہبی طبقہ یعنی پادری، پنڈت وغیرہ سبھوں پر واجب قرار دیا جاتا؛ لیکن ان حضرات کو جزیہ سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے(۱)، اس لئے اس کی حیثیت محض ایک ٹیکس کی ہے، نہ کہ تاوان کی، پھر اس جزیہ کی مقدار بھی کس قدر معمولی ہے؟

کم آمدنی والوں کے لئے سالانہ بارہ درہم، متوسط آمدنی والوں کے لئے سالانہ ۲۴
اور زیادہ آمدنی والوں کے لئے ۴۸ درہم۔(۲)

۱۲ درہم ۳ تولہ سے کم چاندی ہوتی ہے، آپ حضرات خود غور کریں کہ اگر کوئی مملکت کسی شہری کی حفاظت اور سیکوریٹی پر سال بھر میں اتنا حقیر معاوضہ وصول کرے تو کیا یہ زیادتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہماری حکومتیں اتنے پیسے لے کر باشندگانِ ملک کی حفاظت کا انتظام کردیں اور ان کے تحفظ کی ضمانت قبول کرلیں تو ہم شکر گذار ہوں گے، یہ ہے اس جزیہ کی حقیقت، جس کو لے کر معاندین نے ایک طوفان کھڑا کیا ہوا ہے اور اس کو اسلام کے خلاف ظلم وزیادتی، تشدد اور نارواداری کا عنوان دیا گیا ہے۔

پس چہ باید کرد؟

ضرورت اس بات ہے کہ مسلمان اپنے غیر مسلم بھائیوں کو غیر مسلموں کے بارے میں اسلام کی حقیقی تعلیمات، اس کی سیر چشمی، فراخ قلبی اور رواداری سے آگاہ کریں اور خود اپنے رویہ اور برتاؤ سے ثابت کریں کہ اسلام کوئی شدت پسند اور نارواداری مذہب نہیں ہے؛ بلکہ انسانیت پرور، آدمیت نواز، رحم دل، حد درجہ روادار اور سیر چشم وفراخ قلب مذہب ہے اور اس کی ٹھنڈی چھاؤں نہ صرف مسلمانوں؛ بلکہ پوری انسانیت کے لئے مسکن رحمت ہے۔ **إن الدين عند الله الإسلام ۔**

اللهم أرنا الحق حقا وارزقنا اتباعه ، وأرنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه ۔

○ ○ ○

---

(۱) دیکھئے: أحكام أهل الذمة: ۱/۱۴۸، الهداية: ۴/۳۱۸، باب الجزية، نیز دیکھئے: السير الصغير للشيباني: ۲۶۔
(۲) بیهقی: ۹/۳۲۹، حدیث نمبر: ۱۸۶۸۵، باب الزيادة على الدينار بالصلح۔